بند مٹّھی

(افسانے)

نسرین بانو

بند مٹّھی

(افسانے)

نسرین بانو

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

- اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔
- کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
- کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لیے خود مصنفہ ذمہ دار ہے۔

BAND MUTTHI

by

Nasreen Bano

Year of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-680-6
Price Rs. 150/-

نام کتاب	:	بند مُٹھی (افسانے)
مصنفہ و ناشر	:	نسرین بانو
سن اشاعت اوّل	:	۲۰۰۹ء
تعداد	:	۶۰۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی-۶
رابطہ	:	نسرین بانو، سکشن افسر، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ موبائل: 09835401108

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162, 23214465, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

والد محترم

جناب انیس احمد صدیقی

اور

جنت نشیں والدہ مرحومہ صفیہ بیگم

کے

نام

نسرین بانو

فہرست

'بند مٹھی' کے افسانے

نسرین بانو کی تخلیقات سے میں اچھی طرح واقف نہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ محترمہ ایک عرصے سے شعروادب سے دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ افسانہ ان کا ایک خاص میدان ہے۔ انہوں نے اس صنف میں ہندی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کے اکثر افسانے ہندی میں پہلے چھپے اور اردو میں بعد میں۔ آج حالات جس طرح تبدیل ہوئے ہیں ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہندی میں اگر اردو کی تخلیقات چھپتی رہیں تو ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہوسکتا ہے۔ نسرین بانو اگر ذولسانی عمل سے گذر رہی ہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ پھر وہ اپنی زبان سے بھی غافل نہیں۔ چاہتی ہیں کہ جس زبان میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے اس سے نہ صرف واقف رہیں بلکہ عملی طور پر کچھ کارکردگی سامنے لاتی رہیں۔

میرے پیش نظر اس وقت ڈاکٹر نسرین بانو کے چند افسانے ہیں۔ جن کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کا کرب جو تخلیقی روش اختیار کرتا ہے دراصل وہ سماجی ناہمواری ہے، جو ہم لوگوں کے آئے دن کا تجربہ ہے۔ نسرین ہر اس ناہموار Situations کو گرفت میں لینا چاہتی ہیں جو سماجی نقطہ نظر سے ناسور ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے ایک طرح کے افسانے نہیں لکھے ہیں بلکہ ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ لیکن اس تنوع میں جو صورت بہت نمایاں ہوتی ہے وہ کریشن ہے جو ہمیشہ سانحے کے طور پر ابھرتا رہتا ہے۔ انسان کمزوریوں کا پتلا ہے لیکن ذی شعور اور ذی وقار لوگ ایسی کمزوریوں کو بہت متحرک ہونے نہیں دیتے اور بعض پابندیوں سے اپنے آپ کو باندھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ بندھن بہت دیر تک قائم نہیں رہ پاتا ہے اور ٹوٹ بکھر جاتا ہے جس سے کئی ناخوشگوار صورتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایک موضوع تو ایسا کریشن ہے جو مرد و زن کے درمیان عمومی طور پر فعال رہتا ہے اور وہ کام سرانجام دیتا ہے جس کی اجازت سوسائٹی نہیں دیتی۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ کسی نہ کسی طور پر

کریشن اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ اور افسانہ نگار کے کرب میں اضافہ کر کے اس کی تخلیق کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ میں ایک دو مثالوں پر بس کروں گا۔ محترمہ کی ایک کہانی ہے ''گرود کشنا'' استادی اور شاگردی کا پیشہ بڑا مقدس ہے یا ہونے چاہئے لیکن صورت کیا ہے؟ آج کوئی استاد شاگرد کو ایکسپلائٹ (Explied) کرنے میں چوکتا نہیں۔ خصوصاً شاگرد جب شاگردہ کی پوزیشن میں ہو۔ ''گرود کشنا'' میں ایک خاتون ریسرچ اسکالر کی کہانی رقم کی گئی ہے جو اپنے ایک استاد کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ سپردقلم کرنے کی آرزو رکھتی ہے۔ لیکن استاد اس کی اس خواہش سے غافل نہیں ہے اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ وہ اس سے تنہائی میں مل سکے پھر وہ عمل سرزد ہو جو استاد کے لیے ناگزیر ہو بلکہ گرود کشنا ہو۔ حالانکہ خاتون ذرہ برابر بھی اس قبیح عمل کے لیے نہ ذہنی طور پر تیار ہے اور نہ جسمانی طور پر، لیکن شاطر استاد اسے اس مرحلے میں لے جاتا ہے جہاں اس کا Resistance کام نہیں کرتا اور وہ آخرش اس منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں سے وہ بھاگتی رہی تھی۔ اس کے بدلے میں تیار شدہ جلد بند مقالہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ محترمہ نسرین بانو نے اس موضوع پر پراثر طریقے سے بہت کچھ کہنا چاہا۔ جہاں دونوں پارٹیاں آمادۂ بکار ہوں تو افسانہ نہیں بنتا لیکن نسرین نے لڑکی کے کردار کو خاصا معیاری بنا کر پیش کیا۔ اس کی ضرورتیں سامنے کی ہیں لیکن وہ کسی ایسے مرحلے سے گذرنا نہیں چاہتیں جس میں اس کی آبروزد میں آجائے لیکن اس کی شکست ہوتی ہے۔ یہ شکست ناروا سہی لیکن اس سے ٹیچر کے اپنے کردار کی خبر ملتی ہے اور تعلیم کا جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہو رہا ہے لیکن اس کے پیچھے گھناؤنا پن کا جال بچھا ہوتا ہے۔ جہاں کسی بھی معصوم کا پھنس جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ تو یہ وہ سماجی ناہمواری ہے جسے محترمہ نے اپنے خاص اسلوب میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔

نسرین کا ایک دوسرا افسانہ ''خوشبو کا کرب'' ہے۔ منو کی ماں دراصل مردوں کو غسل دے کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ مردوں کے گھر سے جو پلاؤ آتا ہے اسے بچوں کو کھلاتی ہے۔ منو کو اب اس خوشبو سے نفرت ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ماں کے کام کو نہایت غلیظ سمجھتے ہوئے اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن حالات کا جبر اپنی جگہ پر ہوتا ہے۔ پیٹ کی آگ اس وقت تک نہیں بجھتی ہے جب تک کہ غذا مہیا نہ ہو جائے۔ لہٰذا منو بھی آخر کار

شکستہ ہو کر ماں کے کام میں لگنے کی رغبت ظاہر کرتی ہے۔ گویا منو نے یہاں اپنے تمام جسمانی کیف کو دفن کر دیا ہے اور ضرورتوں کے آگے جھک کر کے وہاں پہنچنا چاہتی ہے جہاں پہنچنا اس کے لیے کبھی سخت نا گوار تھا۔ دراصل یہ کہانی ''ضرورت'' کی ہے۔ ضرورت انسان کو اس کے تمام جسمانی کیف وکم کو مردہ کر دیتی ہے۔ احساسات پر پہرے بٹھا دیتی ہے اس حد تک کیا اچھا ہے اور کیا برا اس کی تفریق معدوم ہو جاتی ہے۔ افسانے میں نفسیاتی کشمکش موجود ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے موضوع کو فوراً ختم کرنے کی جلدی نہیں ہے اس لیے واقعات دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں اور پلاؤ کی ناخوشگوار بو اب خوشبو بن جاتی ہے لیکن اس کا کرب لا متناہی ہے جو ہر پڑھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔

میں نے اوپر استحصال کی کئی صورتیں پیش کیں۔ ایک استحصال کا سلوک وہ بھی ہے جو ہم ملازم یا ملازمہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ سلوک کبھی کبھی بے حد اذیت ناک ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ جمالی کیف بھی رکھتا ہے۔ گھر کی ملازمہ کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے یا کیا کیا جاتا رہا ہے۔ اس پر بہت سی کہانی لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی عاصم کی ملازمہ شرمیلی کی ہے جو صرف خوبصورت نہیں بلکہ بے باک اور نڈر بھی ہے۔ اگر عاصم اپنی بیوی کے غائبانے میں اس کی طرف اپنی Idealism کے باوجود جھکاؤ محسوس کرتا ہے تو اس کو ہوا دینے میں ''معصوم شرمیلی'' کا رول بھی بہت اہم رہا ہے۔ بظاہر یہ بند مٹھی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعتاً یہ کھلی ہوئی ہے۔ عاصم کو کھلانے پلانے کے معاملے میں وہ چوکس تو ہے ہی اس سے پیسے وصول کرنے اور تحائف حاصل کرنے میں بھی کوئی موقع جانے نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ عاصم اب اسے اپنی بیوی سے زیادہ ہی چاہنے لگا ہے اور اس کی Idealism پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اب بیوی کے واپس آجانے کے باوجود وہ شرمیلی سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتا اور شرمیلی داؤ پیچ سے اسے اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی ہے، یہاں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ مرد ہی ایکسپلائٹ نہیں کرتے بلکہ عورت بھی۔ یہ افسانہ بہت اچھا ہے اور اس لائق ہے کہ اسے کسی اچھی صف میں جگہ دی جائے۔

کہیں کہیں محترمہ کے یہاں Idealism کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ 'مداوا' ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ ششی کا شوہر ایک فوجی ہے اور وطن کی سالمیت کے لیے شہید ہوتا ہے۔ اسے

اپنے شوہر کی ناوقت موت بے سہارا کر دیتی ہے اور وہ تھوڑے سے وقفے کے لیے انتہائی کرب کے عالم سے گذرتی ہے لیکن اس کے شوہر کی شہادت کے وسیلے سے جب اسے معزز لوگوں کے درمیان ایک تقریب میں 'اعزاز' دیا جاتا ہے تو ششی شوہر کی شہادت کو حب الوطنی کی اٹوٹ کیفیت سمجھتی ہے اور اپنی کوکھ کے فرزند کو وطن کا مایہ ناز فرزند بنانے کا عزم کر لیتی ہے۔ یہ عموی کہانی بار بار دہرائی گئی ہے۔ لیکن مجھے یہاں کہانی سے زیادہ مطلب نہیں۔ مطلب اس Idealism سے ہے جسے محترمہ فروغ دینا چاہتی ہے۔ اسی طرح سے نسرین کے دوسرے افسانے مثلاً 'صبح کی شام'، 'رشتوں کی کرواہٹ'، 'نظر بند'، 'چھاؤں کی دھوپ'، 'منتظر آنکھیں'، 'شک کی صلیب' وغیرہ قابل لحاظ افسانے ہیں جن میں ہماری زندگی کے مختلف انداز اور تیور جذب ہیں اور جن کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع ہے۔ محترمہ اپنی آنکھیں وا رکھتی ہیں اور بہت سے صبر آزما مرحلوں سے گذرتے ہوئے اس کے تصورات ایک کروٹ لیتے نظر آتے ہیں۔

نسرین کی کہانی پیچیدہ نہیں۔ وہ واقعات کو اکہرے انداز میں پیش کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ پلاٹ کو پیچیدہ نہیں بناتیں۔ کرداروں کو غلط اور اغراض کی منزل سے نہیں گزارتیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے مسائلی ہیں۔ پیٹ اور جسم کی بھوک کے علاوہ، دوسرے موضوعات ان کے یہاں فطری انداز میں آتے ہیں جنھیں سہل طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

نسرین بانو چونکہ ہندی کی بھی ادیبہ ہیں لہٰذا ان کے اسٹائل اور ڈکشن میں ہندی کا پٹ ہے۔ کہیں کہیں وہ لب و لہجہ بھی ہے جو ہندی ادیبوں کا رہا ہے۔ یہ اردو دشمنی کا نتیجہ نہیں بلکہ آمنے سامنے چلنے والی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے جسے ہم کسی طرح رد نہیں کر سکتے۔

نسرین بانو کو تکنیکی اعتبار سے بتدریج آگے بڑھنا باقی ہے۔ اردو کی بہت معیاری کہانیاں ان کی نگاہ میں ہونی چاہئے۔ اور افسانہ اپنے طرز اور استدلال میں جس طرح بدلا ہے اس کی بھی خبریں ہونی چاہئے۔ لیکن فی الحال میں ان افسانوں کو دل سے پسند کرتا ہوں جنھیں میں نے پڑھنے کا وقت نکالا اور ان سے محظوظ ہوا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

۶ دسمبر، ۲۰۰۹

وہاب اشرفی

بس یونہی......

اردو نثر نگاری میں صنف افسانہ کو جو مرکزیت اور برتری حاصل ہے، وہ شاید دوسری صنف سخن کو نہیں۔ اس کی سب سے توانا مثال پریم چند کے افسانے سے دی جا سکتی ہے۔

جنگ آزادی سے قبل پریم چند نے جس سماج اور اس کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا مثلاً مفلسی، ناداری، ظلم و بربریت، سرمایہ داری وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں سماج میں موجود ہے۔

پریم چند نے دیہی زندگی اور وہاں کے سماج کے مسئلے کو اجاگر کیا۔ ظلم اور استحصال کے خاتمے کے لیے مظلوم کی حمایت کی۔ ان کی تحریریں مظلوم کی طاقت بن کر حق کی لڑائی لڑنے لگیں۔ جنگ آزادی کے بعد لوگوں کے پاس ماضی کی یادیں تھیں تو دوسری طرف مستقبل کے روشن امکانات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے اور اس کے بعد کے افسانے میں ایسے اجتماعی احساس کی شدت اور وسعت کا بیان ہوا ہے کہ وہ زمانے کا درد بن گیا ہے۔

سماج کے لوگ کس انتشار اور تشدد سے دوچار ہیں، کون سے آپسی اختلافات انسانی اتحاد کو کمزور بنا رہے ہیں اسے ایک فنکار اپنی دور اندیشی سے دیکھتا ہے اسے مثبت سمت اور رفتار کی جانب لے جانے کی ترغیب دیتا ہے۔

گھر کے اندر کی دنیا اور گھر کے باہر کی دنیا میں بڑا فرق ہے۔ گھر کے اندر ذاتی دکھ درد کی زنجیروں کو توڑ کر جب میں گھر کے باہر سماج کے بیچ آتی تو روز بہ روز نئے نئے مسائل نظروں کے سامنے سے گذرتے۔ تب محسوس ہوا کہ اپنا دکھ درد تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سماج کا ہر طبقہ اعلیٰ سے ادنیٰ ذہنی انتشار، کشمکش، جدوجہد سے جوجھ رہا ہے۔ جس ذاتی انتشار کو جیا وہ کم نہیں تھا لیکن ہمت اور حوصلہ نے زندہ رکھا۔ یقین و اعتماد کی پختگی نے بچائے رکھا۔ ورنہ بہت سارے

مواقع ایسے پیش آئے کہ جہاں زندگی سے رشتہ توڑنے کی انتہا پسندی سامنے آتے آتے رہی۔

مجھے لگتا ہے کہ ناخواندہ عورتیں مجھ سے بہتر ہیں، ہمت ور ہیں جو حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتیں بلکہ احتجاج و مخالفت کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ خودکشی کر لیتی ہیں۔ لیکن ہم— گناہ و ثواب کے بیچ تال میل بٹھانے میں لگے رہتے ہیں۔

آج کا انسان باشعور ہو گیا ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ آج انسانی شعور کو مثبت سمت میں لے جانے کے لیے تحصیل علم کی تمام تر آسانیاں موجود ہیں۔ ذی شعوری کے سبب خلوص اور وسیع النظری پیدا ہوئی۔ جس سے انسان نے روز بہ روز سماج کے بدلتے تیور کو پہچاننا سیکھا۔ روایت اور انسانی قدریں بدل رہی ہیں۔ تنگ نظری کے بجائے وسیع النظری بیدار ہوئی ہے۔ لیکن یہ بیداری مکمل نہیں ہے۔ ایک طرف سماج کو بہت خوبصورت بنانے کی مہم چل رہی ہے تو دوسری طرف ہماری کوتاہیاں اس خوبصورتی کو داغدار بھی کر رہی ہیں۔ یہ بدصورتی کبھی کم ہوگی یا نہیں، پتہ نہیں۔ لیکن اسے روکنے کم کرنے کی کوشش اپنی اپنی سطح سے سماجی کارکن عوام اور بااثر باحیثیت لوگ ضرور کر سکتے ہیں۔ فنکار بھی اس کوشش میں شریک ہیں۔ فنکار بھی زمانے کے درد سے تڑپ اٹھتا ہے۔

ایک واقعہ ہوا تھا جہاں ایک خاندان کے نوجوان شخص اور اس کے دو معصوم بچوں کو زندہ آگ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ عورت ایک ساتھ شوہر اور بچوں سے محروم ہو گئی۔ دل دہلا دینے والے اس حادثے نے پورے معاشرے کو متاثر کیا۔ سب نے اپنی اپنی سطح سے غم کا اظہار کیا۔

اتنا ہی نہیں قدرت نے بھی اپنا تیور قدرتی آفات کی شکل میں دکھایا۔ قدرتی آفات قہر بن کر پھوٹا تو کسی کو ایک دوسرے کی چیخ بھی سنائی نہیں دی۔

اچانک رات کی تنہائی کو چیرتی قہر برساتی آواز سے لحہ بھر میں سارا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ چراغ کی روشنی بھی رات کی سیاہی میں گم ہو گئی۔ چاروں طرف چیختی ہوائیں دل کو دہلانے لگیں۔ قدرت کا حملہ محلوں اور پھوس کے مکانوں پر ایک ساتھ ہوا۔ بڑے بڑے تناور درخت گر گئے۔ محلوں کے نیچے ہزاروں جانیں لحہ بھر میں دم توڑ گئیں۔

اس چکروات کے بعد کا منظر اور دردناک ہے۔ زندہ بچے ہوئے لوگوں کو مرے ہوئے

لوگوں کا غم منانے کی بھی فرصت نہیں۔ نوجوان، بچے اور بوڑھے چل رہی سانسوں سے رشتہ جوڑے رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے راحتی کیمپ سے ملا ہوا کھانا پانی دوائیں لوٹ لیتے تھے۔ راحت پہنچانے والوں کا سفر لمبا تھا اس لیے راحت پہنچانے والے کارندے اپنی فکر کئے بغیر نہیں رہ پاتے تھے۔

تین دنوں تک موسلا دھار بارش ہوئی تو لاشیں سڑنے لگیں۔ پورا شہر پانی میں ڈوب گیا۔ لوگ پیڑ کی ٹہنیوں پر پناہ لئے بیٹھے تھے۔ کسی کو کھانا ملا، کسی کو پانی تو کسی کو دوائیاں کسی کو ماچس۔ حتیٰ کہ بوڑھی سانسیں بھی زندگی کی جدوجہد میں لگی تھیں۔ انسان کے گوشت کو بھون کر ایک بوڑھا کچے پکے گوشت کو کھانے لگا۔ اسے دیکھ کر فوج کے ایک کارندے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہاں ہر آنکھیں ہماری نظر عنایت کی محتاج ہیں۔ تب ایک ایک کر تمام فوجیوں نے اپنا اپنا کھانا ان سب کے سامنے رکھ دیا۔

اس واقعہ کو میں نے افسانے کی شکل میں ''منتظر آنکھیں'' عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس واقعہ میں کافی عبرتناک پہلو پوشیدہ ہے کہ لمحہ بھر میں زندگی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔

''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔''

دوسرا واقعہ پھولن دیوی کا۔ اس کی موت پر میں بہت غمزدہ تھی۔ وہ ایک بہادر عورت تھی جسے دھوکے سے مار ڈالا گیا۔ مچھواروں کے بیچ صاف شفاف پانی میں پلی بڑھی، پانی کی ہی طرح صاف ستھرا ذہن اور دماغ تھا۔ دنیا کے داؤ پیچ سے دور۔ اس کی عزت سے کھلواڑ ہوا تو کس طرح اس نے بہادری سے بدلا لیا اور پھر جیل کی لمبی سزا گیارہ برس کی کاٹی۔ اس کے بعد جب وہ سماج کے مین اسٹریم میں شامل ہوئی تو عوام کے مسئلے مسائل پر گہری نظر رکھنے لگی۔

پروش پردھان سماج کو شاید ناگوار ہوا اور بے رحمی سے اس کی زندگی کو ختم کر دیا۔ میں نے ''خاموش سمجھوتہ'' عنوان سے یہ افسانہ تحریر کیا ہے۔ اسی ضمن میں ایک سیاسی رہنما کی بہو کی پوری زندگی گھر اور سسرال کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہی گذر گئی۔ چونکہ شادی پسند کی ہوئی تھی۔ اس لیے گھر سے الگ ہو کر لڑکے کو رہنا تھا۔ گھر چلانے کے لیے عورت کو بھی پرائیویٹ نوکری کرنی پڑی۔ پہلے ٹیچر ہوئی پھر میڈیا سے جڑ گئی۔ جب شوہر کے مالی حالات

استوار ہو گئے تو انہیں بیوی کا باہر جانا، پارٹیاں اٹنڈ کرنا ناگوار گذرا۔ پھر علیحدگی ہوئی۔ دو بچوں کی پرورش کی ذمہ داری عورت پر آ گئی۔ وہ سابق شوہر سے بچوں کے خرچ کے لیے تھوڑی مدد ضرور چاہتی تھی لیکن اس جھگڑے کورٹ کچہری کے جھنجھٹ سے عاجز آ کر جانے کب کس نے اس عورت کو تیسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ وہ مر کر تمام دکھوں سے آزاد ہو گئی۔

اسی طرح کارگل جنگ میں ڈیوٹی پر لگے یا شہید ہونے والے فوجیوں کے گھر والوں کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے اس موضوع کو لے کر بھی افسانہ تحریر کیا ہے۔

بہار بٹوارے سے عام لوگوں کی کیا امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ پوری ہوئی کہ نہیں یا یونہی اپنے خوش آئند مستقبل کی راہ دیکھتے دیکھتے زندگی گذر رہی ہے۔ اسے بھی تحریر کیا ہے۔

مذکورہ احوال کے ذریعہ دراصل میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میرے افسانے اسی دنیا سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے ساحر کا وہ شعر یاد آتا ہے جسے معمولی تحریف کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت کر رہی ہوں:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہی ہوں میں

امید ہے مجھے اپنے افسانے پر آپ کی آراء سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔

۲۳ نومبر، ۲۰۰۹

نسرین بانو

■■

خوشبو کا کرب

پلاؤ کی خوشبو سے اسے سخت نفرت تھی۔ جبکہ یہی پلاؤ اب ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک مرغوب ڈش ہے۔

پلاؤ کی یہ خوشبو اس معصوم بچی منو کے دل و دماغ کو مکدر کر دیتی ہے۔

ہر دو چار دن پر اور کبھی تو روز بہ روز ہی پلیٹ سے ڈھکے ہوئے پرات میں خوشبو بکھیرتا ہوا پلاؤ اپنی موجودگی کا احساس کرا جاتا۔ تب منو کا من بلبلا اٹھتا۔ اور وہ گھر سے باہر نکل جاتی۔

جب گلیوں میں دوسرے گھروں کے چولھے کے دھوئیں کے ساتھ ہی سبزی کے چھونکنے کی گندھ اس کے ذہن سے اُٹھ رہی پلاؤ کی خوشبو پر ایک دبیز چادر ڈال دیتی تب کہیں جا کر اس کی سانسیں استوار ہو پاتیں۔ ورنہ اسے گھٹن محسوس ہوتی۔

یہ کیسی بے بسی تھی جو سات آٹھ برس کی منو کو یہ بات اپنی ماں سے کہنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔

جب تک اس کا ابودھ ذہن اس بات سے بے خبر تھا کہ یہ پلاؤ کہاں سے آتا ہے۔ تب تک اسے بڑی بے صبری سے انتظار رہتا تھا کہ کب پلاؤ آئے اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بانٹ کر کھائے۔

ڈھلتی شام کے ساتھ اندھیرا لپکنے کو تھا۔ اماں جلدی جلدی تیار ہوئیں۔ چادر لپیٹا، پان کا ڈبہ ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف تیزی سے بڑھ گئیں۔

''کہاں جائے رہیو اماں۔ ہم کا بھی لے چلو۔'' منو نے آواز دی۔

''تو کہاں جیہو۔ ابا آتے ہوئی ہیں، دکان سے۔'' ماں نے کہا۔

"نہیں اماں سنو ہم کا مارے گی۔ ہم کا اپنے ساتھ لے چلو۔"

اماں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اسے سمجھاتیں۔ ججمان کے یہاں سے دو آدمی آکر دروازے پر کھڑے تھے۔ اماں نے منو کے کان میں اوڑھنی باندھی اور ساتھ لے کر چل پڑی۔

منو خوش تھی۔ اماں آج اسے پہلی بار اپنے ساتھ لے کر جا رہی تھی۔ گلیاں، نالے اور سڑکیں پار کر کے وہ رکشے پر سوار ہوئی اور تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس نامعلوم جگہ پر پہنچی، جہاں پہلے سے ہی بہت سارے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں آہ و بکا کر رہی تھیں۔ اماں نے اسے ایک خاص جگہ پر کچھ بچوں کے ساتھ کھیلنے کو چھوڑ دیا۔ جہاں وہ کھیلتے کھیلتے جانے کب سو گئی۔

جب نیند کھلی تو اماں کو کام میں مصروف پایا۔

وہ مردے کو غسل کرا رہی تھی۔ ماں نے سب سے پہلے مردے کو چادر سے الگ کیا۔ مردے کی ناک سے نکل رہی پیپ کی غلاظت کو کپڑے سے صاف کیا۔ اسے پلنگ سے اتار کر تختے پر لٹا دیا۔ جسم کے کپڑے کو بیچ سے چاک کیا۔ اسے جسم سے الگ کر کے سفید چادر اوڑھا کر نہلانے لگی۔ بالوں میں صابن کی جگہ مٹی کا لیپ لگایا۔ کئی عورتوں نے باری باری سے مردے پر پانی ڈالا۔ نہلانے کے بعد ناک اور کان میں روئی لگائی۔ دونوں پیروں کو دھاگے سے باندھ دیا۔ اسی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا۔ وہ مردے کے جسم سے اترے کپڑے اور کچھ دوسرے خشک کپڑوں کی گٹھری لے کر گھر لوٹ آئی۔ راستے میں منو خود کو ماں سے الگ کیے رہی۔

منو غسل کے سارے عمل کو کراہیت کے باوجود بت بنی ایک ٹک دیکھتی رہی تھی۔

گھر لوٹ کر ماں نے پہلے کپڑوں کی گٹھری کھول کر انہیں دھویا پھر الگنی پر پھیلا دیا۔ بعد میں خود غسل کیا۔

منو کو الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑوں سے وہی گندہ سا مردہ نظر آیا۔ جس کی ناک سے پیپ نکل رہی تھی۔ اب تک کے اس عمل نے ذہن پر ایسا گہرا اثر ڈالا کہ وہ بیمار ہو گئی۔

ماں مردہ نہلانے والے اسی گھر سے تیسرے دن ڈھیر سارا کھانا لائی۔ وہی خوشبودار پلاؤ— جو نہ معلوم کب سے اس کے دل و دماغ کو ایک غیر محسوس گرفت میں لیے اپنی خوشبوؤں کی ضرب کاری لگا رہا تھا۔ ساتھ میں میٹھا پلاؤ، سالن اور روٹیاں بھی۔

''اماں یہ کام تم چھوڑ دو۔ ورنہ ہم مر جائیں گے۔'' ایک دن ہمت جٹا کر منو نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''بڑی آئی مرنے والی۔ مر جا۔ تجھے بھی نہلا کے دفن کر دیں گے۔'' ماں کا جواب ممتا بھرے دل سے خالی تھا۔

اب اکثر وہ اپنی ہم عمر سہیلی صائمہ کے گھر چلی جاتی۔ اس کے گھر کی پکی ہوئی دال اور چاول مانگ کر کھالیتی۔ اور کہتی اگر تو کہے تو بدلے میں سالن اور پلاؤ لا دوں۔

''نہیں ہم لوگ تمھارے گھر کا نہیں کھاتے۔'' صائمہ نے جب ایسا کہا تو اس کے ذہن کو ایک نیا سوال پریشان کر گیا۔

اسی ذہنی اور قلبی اضطراب کے طوفان میں اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کٹ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے زندگی کا وہ پڑاؤ بھی آ گیا۔ جہاں پہنچ کر ہر لڑکی سماجی تقاضوں کے تحت اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔

ماں نے اس کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔

اپنی شادی کی خبر سن کر اسے بے حد مسرت ہوئی۔ مسرت کی نئی لہروں کے اس احساس سے چند لمحوں کے لیے وہ اپنی حالیہ زندگی کے تلخ تجربات کو فراموش کر گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ شائد اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا موقع قدرت نے فراہم کر دیا ہے۔

یوں تو اس کی سسرال والے بھی ذات کے نائی تھے۔ لیکن لڑکا چوڑی کا کام کرتا تھا۔ وہ خوش تھی کہ شائد وہ اس کربناک زندگی سے رہائی پالے گی۔

دلہن کے جوڑے میں منو کا نسوانی حسن نکھر آیا تھا۔ گھونگھٹ میں نیم پوشیدہ اس کا حسین چہرہ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے بادلوں کی اوٹ میں نور افشاں چاند کا ٹکڑا چھپا ہو۔

سرخ دوپٹے میں اس کا چہرہ اتنا دل کش لگ رہا تھا کہ اسے دیکھ کر کسی اجنبی کو یہ احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک غریب کی بیٹی ہو۔

شب رفاق میں سجی سنوری منو اپنی آئندہ زندگی کے حسین خوابوں کی ترتیب میں مشغول تھی۔

تبھی منو کے دل کی کشتی اس وقت غم میں ڈوب گئی جب اس نے پہلی بار اپنے شوہر کو شراب کے نشے میں چور پایا۔ چاند شرمندہ ہوکر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس نے ڈگمگاتے قدم اور لرزتے جسم سے منو کو اس طرح اپنے حصار میں قید کرلیا جیسے کوئی شکاری پھڑ پھڑاتے پرندے کو پنجڑے میں قید کرلیتا ہے۔

اس کی تمنائیں پھڑ پھڑا کر دم توڑ گئیں۔

جلد ہی منو کی زندگی بھک مری کی دہلیز پر آگئی۔ اس کا شوہر اپنی کمائی جوئے، شراب اور پوری کچوڑی میں اڑا رہا تھا۔ گھر میں اتنا ہی دیتا جس سے روٹی دال چل پاتی۔ یا کبھی کبھی وہ بھی دینا بھول جاتا تھا۔

ان ناموافق حالات اور کشمکش کے بیچ اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اور اس کی پرورش کرنے لگی لیکن اس کی پرورش بھی اس فاقہ کشی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

میکے میں اس کی ماں بھلے ہی مردہ نہلاتی تھی اور اپنے بچوں کی پرورش کرتی تھی۔ لیکن وہاں بنیادی ضرورتوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تو بچے کی مالش کے لیے تیل بھی میسر نہیں۔

ماں کے تئیں دل میں حقارت کی جڑ مضبوط ہوتی گئی مگر نفرت کے سبب وہ کھل کر کبھی کچھ کہہ نہیں پاتی تھی۔

ایک دن اس کی ساس نے کہا کہ میں بچوا دیکھ لوں گی تو کیوں نہیں دو چار گھروں میں جھاڑو برتن کے کام سنبھال لیتی۔ کھر چا بھی نکل آئے گا اور بچوا کی پرورش بھی آسان ہوجائے گی۔ اس نے ویسا ہی کیا۔

ابھی ایک ہی گھر میں کام مل پایا تھا جسے وہ کرنے لگی دوسرے گھروں میں بھی کام کی بات کرنے گئی اور کام مل بھی گیا۔

اسی دوران بری نظر کا سایہ اس کی جواں عمر کو اثر انداز کرنے لگا۔

کسی طرح وہ عزت کا بوجھ اٹھائے لوٹ آئی۔ ماں کو بتایا۔ ماں نے کام چھوڑ دینے کی صلاح دے کر اس کو راحت بخشی۔

جلدی ہی محلے کی ایک عورت کے ساتھ وہ مزدوری کا کام کرنے لگی۔ کیونکہ بغیر کام کئے دو وقت کی روٹی کا گزارا نا ممکن تھا۔

مزدوری کا بوجھ اٹھانے کی اسے قطعی عادت نہیں تھی، اس نئے تجربے سے وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئی۔

ایک دن اس نے سوچا کیوں نہ کچھ دن ماں کے پاس چل کر رہا جائے۔ جسم کو آرام بھی مل جائے گا اور دل بھی بہل جائے گا۔ اب وہ میکے جانے کے لیے بے چین ہو اٹھی۔ لہٰذا ساس ماں سے اجازت لے کر وہ میکے آ گئی۔

ماں اپنی بیٹی منو کی آمد پر بہت خوش تھی۔ جب بھی باہر سے آتی۔ اس کے جھولے اور آنچل میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ منھ میں پان چباتی ہوئی سامانوں سے لدی پھدی وہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوتی تھی۔

ایک دن اماں پھر وہی خوشبودار پلاؤ لے کر آئی۔ منو بے چین ہو اٹھی۔ اس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اچانک ہاتھ رک گئے...... وہی مردہ ...... ناک سے بہتی ہوئی گندگی۔

منو کا چہرہ تمتما گیا اور ہونٹ بھینچ گئے۔ مٹھیاں تن گئیں۔ ماں اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔......

کیا ہوا منو......؟

منو ایک ٹک پلیٹ کو گھور رہی تھی اور پھر اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ آنسو کی ایک بوند پلیٹ پر ٹپک پڑی۔

ماں، کیا ہمارے نصیب میں مردے کا ہی کھانا لکھا ہے؟

ہاں کیونکہ ہماری ذات ہی یہی ہے...... ماں نے آہ بھری۔

منو نے آنسو پونچھے اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''نہیں ماں ...... یہ ہماری ذات نہیں ہے ...... میں محنت کروں گی ماں ...... میں مزدوری کروں گی......''

منو گھر سے باہر نکل گئی۔ پاس کے گھر سے دھواں اٹھا۔ سبزی چھونکنے کی خوشبو پھیل گئی۔ منو کے قدم رک گئے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور گہری سانس لی...... مانو چھونک کی خوشبو کو روح میں بسالینا چاہتی ہو۔

اس کے ہونٹوں پر دھوپ جیسی مسکراہٹ تھی۔ اور چہرہ ایک نئے عزم سے دمک رہا تھا۔

■■

مداوا

لمبی رات کے گزرنے کے بعد مشرق کے افق پر دمکتا ہوا آفتاب نمودار ہوا۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آتی ہوئی سنہری کرنوں سے گیلری اور آنگن جگمگا اٹھا اور خوشگوار ماحول کے رنگ و رونق نے دل میں محبت کا گہرا احساس جگا دیا۔

کمرے کی ہر شئے اپنی ہی روشنی سے منور نظر آ رہی ہے۔ میز پر روزنامہ رکھا ہے۔ اخبار کی سرخیوں پر نظر پڑتے ہی ششی کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے لرز اٹھتا ہے اور دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ اخبار رگھو کو تھما کر وہ کچن کی جانب چلی جاتی ہے۔ رگھو نے اخبار ہاتھ میں لیا اور ماں کو بڑھا دیا۔ ماں نے اخبار پر نظر ڈالے بغیر بابوجی کو تھما دیا۔ بابوجی اخبار لے کر برآمدے میں چوکی پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ادھر کچھ دنوں سے گھر کا کوئی بھی فرد اخبار پڑھنے کو لپکتا نہیں۔ صرف بابوجی ہیں جو اخبار پڑھتے ہیں اور اپنے چہرے کے نشیب وفراز کو ظاہر نہ ہونے دینے کی کوشش میں دوسرے فرد کی نظر سے بچا کر پڑھتے ہیں۔

بابوجی کے ناشتہ مانگنے پر سب کے دل کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ ماں دل ہی دل میں سوچتی ہے، نہ جانے کب یہ بلا ٹلے گی اور ہم سب کی ہنسی اور مسکراہٹ واپس آئے گی۔

کپڑے دھوتے وقت ششی کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں تو اس نے ہاتھ روک لیے۔ دل بے چین ہو اٹھا۔ کپڑوں کے ڈھیر کو ایک کونے میں سرکا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماں برآمدے میں چوکی پر بیٹھی شالو کے کپڑے بدل رہی تھیں۔ شالو ماں سے زیادہ

دادی کے قریب رہتا ہے۔ ششی ان کے پاس چوکی پر بیٹھ گئی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھ بیٹھی—

''ماں شام کو کون سی سبزی بنے گی؟'' بہو کی آواز پر ماں نے نظریں اٹھا کر اس کے سراپا وجود کا جائزہ لیا۔

ماں کی نگاہوں کا گہرا لمس پا کر اس کے اندر لرزش کا احساس ہوا۔ ماں بے دلی سے کہتی ہے—

''کوئی بھی سبزی بنالے بہو، میرا جی اچھا نہیں ہے۔''

بہو آلو پرول لے کر انہیں کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہر لمحہ اس کی نگاہوں میں سونی راہوں کا عجیب وغریب منظر ابھر آتا ہے۔ گھر کے ماحول میں اداسی اور ویرانی چھائی رہتی ہے۔ چوکا کرتے وقت نند بھاوج، دیورانی، جیٹھانی کے درمیان ہونے والی ہنسی اور ٹھٹھولی کو جیسے کسی کی نظر لگ گئی۔ سب خاموشی سے اپنے اپنے کام میں لگی رہتی ہیں۔ کوئی کام ہوتا تو پہلے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتیں تب کہیں کچھ بول پاتیں۔

ماں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دعائیں کرتیں—

''ایشور! میرے سپوت کی حفاظت کرنا۔''

شام کے وقت شالو نے ٹی وی آن کیا اور دوڑ کر دادی کو بلا لایا۔ علاقائی خبروں کے درمیان دادا نہ جانے کیا کیا سمجھا دیے ہیں کہ وہ بڑی چاہت سے ٹی وی کی جانب تکتا رہتا ہے۔

لیکن ششی کی آنکھوں کے سامنے ٹی وی دیکھنے سے پہلے ہی ریگستان کی سی ویرانی اور اس پر بکھرے رتن 'بھارت ماں کے سپوت' کی شکل میں تعینات نظر آتے۔

دل کے ایک گوشے سے آواز آتی کہ اپنے شوہر کو ملک کی حفاظت کے لیے قربان کر دو۔ دوسرے گوشے سے ایک سوال ابھرتا کہ اپنی نجی زندگی کو کس کے سہارے چھوڑا جائے۔ ان کی فرقت میں افسردہ دل کے ساتھ زندگی کیسے گزاری جائے گی۔

ان دنوں وہ گھر کے افراد کے رحم وکرم کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔

شالو کو اسکول کے لیے تیار کرنا ہوتا تو نند تیار کر دیتی۔ سبزی ماں لے کر کاٹ دیتی۔
بابو جی بھی اس سے چوکے کے سامان کے بارے میں پوچھتے رہتے کہ —
''چوکے اور اسٹور میں کیا ہے اور کیا نہیں۔''
دیورانی سے اداس نگاہیں ملتیں تو وہ بھی اس کی خدمت کو تیار ملتی۔ کبھی اس کا دل بھی چوڑیوں کی آواز پر کہہ اٹھتا—
''ایشور! ان کے سہاگ کے رنگوں کی حفاظت کرنا۔''

مہینوں گزر گئے۔ ہر شخص مضمحل اور پریشان ہے۔ دروازے کی ہر آہٹ پر گمان ہوتا ہے جیسے وہ آن پہنچا ہو۔
اس کے شوہر شری گپت کی تقرری یونٹ ۲۲ گرینیڈیرس رجمنٹ میں لانس نایک کے عہدے پر ہوئی تھی۔
شوہر کی محبت میں وہ پورے خلوص کے ساتھ تصوراتی سطح پر سرشار رہتی ہے۔ وہ اس کے ذہن وفکر پر حاوی ہے، غالب ہے۔
اس کی یادوں کا یہ دلکش خواب ہی اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ نیند کا خمار اس کی آمد کے احساس میں تبدیل ہو کر اسے بیداری کی کیفیت میں رکھتا ہے۔
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تاریکی اور رات کے سناٹے میں سرسراتی ہوا دلخراش آواز اس سے یہ کہہ رہی ہو—
''تیرے انتظار کا وہ مرکز، تیری آرزوؤں کا وہ حاصل نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ شاید وہ اب اس دروازے پر کبھی نہیں آئے گا۔ اب تجھے یوں ہی تصورات کی حسین وادیوں میں بھٹکتے رہنا ہوگا۔''
پانی کے دو چار چھینٹے پڑتے ہی آنکھیں پوری طرح کھل جاتی ہیں۔ تولیے سے چہرے پر بکھرے پانی کے قطرات کو خشک کرتے ہوئے وہ آئینے کے قریب گئی۔ آئینے میں مانگ کا سیندور اس کی تضحیک کرتا ہوا لگا۔ لہٰذا اس نے آئینے کی طرف پیٹھ کرلی۔

دو تین قدم آگے بڑھی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ شب کے تیسرے پہر باہر سے آرہی ہلکی ہوا کی خنکی ماحول کی تازگی کا احساس کرا گئی۔

خیالات کے ادھیڑ بن میں اسی طرح صبح ہوگئی۔ نیچے برآمدے میں بابو جی ٹہل رہے تھے۔ ان کی بے چین نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی ہیں۔

کبھی وہ بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تو کبھی گھر کے سامانوں کی ترتیب درست کرتے ہوئے نظر آتے۔ ان کے اس اضطرابی طرز عمل سے صبح کے مسحور کن ماحول کی تازگی بھی اداس ہوگئی۔

بہو سے بابو جی کی نظریں ملیں اور ہٹ گئیں۔ آج وہ چائے، ناشتے اور اخبار کے مطالعے نہیں کر رہے، ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، منہ کی لالی اور آنکھوں کی روشنی بجھی ہوئی ہے۔

''بابو جی'' بہو کی مجبور اور کمزور آواز ان کے کانوں میں گئی۔ لیکن بابو جی معنی خیز خاموشی ہی اختیار کیے رہے۔

ماں جی کمرے سے نکل کر بابو جی کے قریب آئیں۔

''یہ صبح سے گھر کے سامانوں کی ادھیڑ بن کیوں ہو رہی ہے؟ چوکی پلنگ اپنی جگہ سے......''

''آج بہت خوشی کا دن ہے مالتی! آج ہمارا بیٹا آرہا ہے۔'' پھر وہ پل بھر کے لیے رکے۔

''بڑی دھوم دھام، بڑی عزت کے ساتھ اسے لایا جا رہا ہے۔''

انہوں نے ماں کی بانہیں پکڑ کر چوکی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم شہید کی ماں بن گئی مالتی......''

''مالتی ہمارا بیٹا ملک پر قربان ہو گیا۔'' کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ اور ماں پتھرائی سی ان کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی۔

دیگر افراد خاندان کا مل کر رونا ان کی مجبوری بن گئی۔ بابو جی غم کے اس بوجھ کو شہادت

کی خوشی کہہ کر ہلکا کر رہے تھے۔ لیکن بہو کا دل اسے اس طرح ماننے سے عاری تھا۔

ماتمی دھن کے ساتھ شہید کو سلامی دی گئی۔

آخری وداعی کے وقت بہو کی دلدوز چیخ سے سارا ماحول سوگوار ہو گیا۔

تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کا ہفتوں تانتا لگا رہا۔ کئی معزز لوگوں نے شہید کی بیوہ کو تسلی دی اور اس کے معصوم بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھا۔

معصوم بھی قدرت کی اس ستم ظریفی کو سہمی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ششی کے لیے شوہر کی یاد ہی اس کی ویران زندگی کا سہارا بنی رہی۔

جس وقت معزز لوگوں کے بیچ ایک تقریب میں اسے اعزاز عطا کیا گیا تو ششی کا دل شوہر کی شہادت پر بول اٹھا۔

صحیح معنوں میں شوہر دیوتا ہے جو مر کر بھی اتنی عزت دے گیا۔ آج مجھ عورت کا جنم کامیاب ہو گیا۔

اب میری زندگی کا مقصد اپنے بیٹے کو حب الوطنی کی تعلیم دینا ہے تاکہ میری کوکھ بھی ایک ماں کی حیثیت سے کامیاب ہو جائے۔ وہ بھی وطن کا مایۂ ناز فرزند ثابت ہو سکے۔

اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا دل فخر و انبساط کے جذبوں سے معمور ہو گیا۔ اسے اپنے بیٹے کے مستقبل کی شکل میں اپنے تمام دکھوں کا مداوا نظر آیا۔

■■

وہ ہماری کون تھیں؟

انہیں لوگ جہنمی کہتے تھے۔

جہنمی ہے یہ عورت، جہنم میں جائے گی۔

کیوں بھئی۔ کیوں کہ یہ فراٹے سے مردانی گالی بکتی ہے۔ درجنوں بچوں کو پیدا کر کے محلے میں ہڑدنگ مچانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ کیا مجال کہ اس کے بچوں کو کوئی بھلا برا کہہ دے یا ان بچوں کی شکایتیں لے کر ان کے پاس پہنچ جائے۔

دروازے پر کھڑے ہو کر وہ صلوٰتیں سناتیں کہ سننے والا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا۔

شیر کی طرح دہاڑنے والی عورت آج پلنگ پر بے بس پڑی ہے۔ اپنی آواز سے گلی محلے کو ہلا دینے والی گونج دھیرے دھیرے ڈوب رہی ہے۔

مجھے یاد ہے وہ کسی کے بچوں کو کبھی مارتی پیٹتی نہیں تھیں۔ صرف اتنا کہتیں۔۔

"جا اپنی مہتاری کو بھیج دے۔"

انہیں شکایت تھی ان ماؤں سے جو اپنے بچوں کو پیٹتی ہیں۔ اور دوسرے کے بچوں کی شکایت کرنے ان کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔

اکثر میں جب اس بھیڑ بھاڑ والے شہر سے ہو کر اس چھوٹے شہر میں جاتی تو اپنے گھر پہنچنے سے پہلے ہی موڑ پر ان کا گھر مل جاتا۔

وہ چوکھٹ پر بیٹھی بیڑی بناتی ہوئی مل جاتیں۔ اگر اس وقت نہیں ملتیں تو بازار ہاٹ

جاتے وقت اکثر ان سے ملاقات ہو جاتی۔ ان سے ملنے ان کے گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

وہ گلی میں دروازے پر نل پر پانی لیتے ہوئے ضرور مل جاتی تھیں۔

''کب آئیو بہنی ابھی رہیو نا!'' وہ پوچھتیں۔

''ہاں دو چار دن۔''میں انہیں بتاتی۔

''ٹھیک ہے آویں گے گھر۔''

اور جب گھر آتیں تو پورے محلے کی خیریت ہنس ہنس کر بتا جاتیں۔ اپنے گھر کے دکھ درد کو بھول کر۔

مگر ان کی صحت، ان کے حالات، ان کی غریبی کی کہانی کہتے تھے۔

لڑکے دھیرے دھیرے سیانے ہونے لگے۔ ان میں ایک چور نکل گیا۔ کھلا گھر پا کر یا چھت سے لوگوں کے گھروں میں کود کر چوری کرتا اور جب تک لوگ نیند سے غافل ہوتے وہ فرار ہو جاتا۔ اس طرح کے تین چار لڑکے اور تھے جو ساتھ مل کر یہ کام کرنے لگے۔

بڑا لڑکا جسے بچپن میں بڑے شوق سے انگریزی اسکول میں نام لکھوایا تھا۔ ڈریس پہنا کر دروازے تک چھوڑنے آتیں تو بڑی حسرت سے دیکھتی رہتیں۔ کوئی اگر پوچھ دیتا کہ —

''اسکول میں دل لگا کر پڑھتا ہے نا کہ تنگ کرتا ہے۔''

''نہیں بڑے مزے میں رہتا ہے۔ خالی گھروے میں رہتا ہے تو چلاتا چھکرتا ہے۔''

کسی طرح اس نے چھٹی ساتویں تک پڑھائی کی۔ پھر اسے سرکاری اسکول میں ڈال دیا گیا۔ سرکاری اسکول میں ساتھیوں کا ایسا اثر ہوا کہ وہ افیون کا کام کرنے لگا۔

اب وہ اس افیون کے دھندے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں لڑکا بھی اسی طرح کے کام کرنے لگا۔ جس میں محنت کم اور مال زیادہ ملے۔ اور اس کا کام بھی کسی کی نظر میں نہ آئے۔

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اپنے

بچوں کی پرورش کی تھی۔

زمانے کی بری نگاہوں اور برے الفاظ سے بچانے کے لیے خود کی زبان گندی کر لی تھی۔

تب میں بی۔اے کر چکی تھی۔ مجھ سے چھوٹے چار بھائی بہن اور تھے۔
جب ہم سب بن ماں کے ہو گئے۔ تب وہ ہماری نگہبان بن گئیں۔
وہ ہر روز ہمارے گھر آتیں کبھی بیڑی کا سوپ لیے ہوئے کبھی خالی ہاتھ۔ اور کہتیں—
''سوچا چلیں چھوٹے چھوٹے لڑکن گھر میں گھبراتے ہوں گے۔ ذرا دیکھ آویں۔''

پھر ہمارے گھر بھاوج بیاہ کر آ گئیں۔ تب وہ ان کی ساس بن گئیں۔ اور انہیں ہمارے گھر کے سنسکار بتانے لگیں۔ ان کو نصیحتیں کرتیں، مگر بڑی محبت سے۔

ہماری بھاوج بھی ان سے باتیں کرتیں۔ ان کی عزت کرتیں اور خاطر بھی۔

ذات برادری والے سفید پوش ہمارے رشتہ دار اعتراض کرتے کہ ان سے دوستی نہیں رکھنا چاہئے۔

ہمارے بھائی مہذب تھے۔ انہوں نے انہیں ہمیشہ ماں کی نظر سے دیکھا۔ وہ آتیں، ان کے ساتھ چھوٹے بچے آتے۔ وہ انہیں کافی بسکٹ، یہاں تک کہ کھانا کھلانے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کے آنے سے گھر میں اکسٹرا رونق آ جاتی۔

ہم بھائی بہنوں نے کبھی انہیں چچی، خالہ مومانی نہیں کہا۔ صرف 'اکرم کی اماں'۔

ان کے شوہر لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ پریشان تو اکثر ہی رہتی تھیں۔ مگر منہ کبھی نہیں کھولتی تھیں۔

جب میں بچوں کو کچھ روپیہ دیتی تو وہ منع کرتیں۔ مگر ہمارے یہ کہنے پر کہ ہم اپنے بھائی بہنوں کو دے رہے ہیں تو وہ خوش ہو کر خاموش ہو جاتیں۔

ایک بار صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جب میں گھر پہنچی تو ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور کئی دنوں تک مجھے بھی ان کا خیال نہیں آیا۔

ایک دن کمرے کی دھلائی کرتے وقت باہر کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ آنچل میں کچھ لیے ہوئے گلی سے جارہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی اور سلام کیا۔ جواب دے کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ مجھے فکر ہوئی کہ کیا بات ہے۔ وہ نظریں کیوں چرا رہی ہیں۔

گھر میں معلوم کیا کہ کیا بات ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا تم لوگوں سے۔ تب میری بھاوج نے مایوس لہجہ میں بتایا— ''آج کل وہ پریشان ہیں۔ ان کا بڑا لڑکا جیل میں بند ہے۔ افیون کی پڑیا سپلائی کرنے کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ پورے گروہ کا سرغنہ بن گیا ہے وہ۔''

سارا سارا دن وہ شہر کے چکر کاٹتیں۔ لوگوں سے سفارش کراتیں کہ کوئی ان کے لڑکے کو چھڑا دے۔ کھانا پہنچانے جیل جاتیں تو وہاں لوگوں سے کہتیں—

''بھیا ہمرے لڑکے کو ماریہو مت۔'' ننھے پوتے کو گود میں دبائے رہتیں۔ اس کا واسطہ دیتے ہوئے کہتیں—

''بھیا ای بچوا کی خاطر اوکو مر ہیومت۔''

پچھلی جولائی میں میرے گھر بڑے پیر صاحب کا فاتحہ تھا۔ میں نے اس موقع پر انہیں بھی مع بچوں کے بلایا تھا۔

تین چار شفٹ کھانا چل چکا تھا۔ تب وہ بچوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی پہنچیں۔ میں انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ اور جلدی سے ان کے لیے جگہ کی۔ تب تک وہ خود ہی کمرے کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ تبھی میں نے پلیٹیں لگادیں۔

کچھ اور پڑوس کی لڑکیاں بیٹھ رہی تھیں کہ تبھی میں نے انہیں بھی اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھ ہی رہی تھیں کہ ان میں سے ایک لڑکی جو کھانے کے لیے بیٹھ چکی تھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی کہ ہم بعد میں کھائیں گے۔

ان کی تجربہ کار نگاہیں پہچان گئیں کہ ہمارے ساتھ کوئی بیٹھ کر کھانا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ہم غریب ہیں اور میلے کچیلے کپڑوں میں رہتے ہیں۔

''کھائے دو بہنی ان لوگوں کو۔ ابھی ہمیں جلدی نا ہے۔''

مجھے افسوس ہوا۔

دوسرے دن جب سناٹا ہوا تو گھومتے ہوئے وہ ہمارے گھر آ گئیں۔ کل کے واقعہ کا احساس انہیں شدت سے ہوا تھا۔ کہنے لگیں۔

''اولڑکیا جو دیکھ کے منہ بنائس رہا کہ ساتھ میں کھانا نہیں کھائیں گے۔ جب چھوٹی رہی تو ایک بیری بیماری میں پڑ گئی رہی۔ اوکی مہتاری ہمیں آواز دہین کہ چچی گھر میں کوئی مرد نہیں ہے ذرا ا ایکو ڈاکٹر کو دکھا دیجئے۔ تب ہم جلدی سے گھر گئے۔ چادر اوڑھا اور او کے لیکے ڈاکٹر باجی کے یہاں گئے۔ آج ہمیں دیکھ کے منہ بنائے رہی۔''

مجھے معلوم تھا ان کے گھر کی عورتیں باہر نہیں نکلتیں۔ پھر آگے انہوں نے کہا۔

''موٹا جھوٹا کام کرائی ہیں لوگ سے تب بے عزتی نا ہوئی۔ پاس بیٹھے سے کپڑا ہم لوگ کا مہکتا ہے۔'' میں سمجھ رہی تھی انہیں کل کے برتاؤ سے بہت برا لگا ہے۔

آج وہ عورت اپنی عزت بچانے کے لیے نظریں چرا رہی تھی۔ دوسروں کی خیریت بتانے والی عورت میں اپنی ہی خیریت بتانے کی ہمت نہیں تھی۔

ان کی ایک لڑکی جو باجی کے گھر رہتی تھی ان کے گھر کا کام کرتی تھی کہ باجی کی لڑکین اس کو تھوڑا بہت پڑھا دیں گی۔ باجی کی لڑکیوں نے ویسا ہی کیا۔

تب وہ ہوش میں نہیں تھیں۔ جب انہیں اعظم گڑھ کے سرکاری اسپتال میں بھرتی کرایا گیا تھا۔ مہینوں یہاں بستر پر پڑی رہیں۔ جب تھوڑا ٹھیک ہوئیں تو بچوں اور شوہر کے لیے تڑپنے لگیں۔ دو بیٹے ان کے ساتھ تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ اب نہیں بچیں گی۔ ٹی بی تو انہیں تھی ہی۔ اور نہ جانے کن کن بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔

انہوں نے بڑی لاچاری سے کہا تھا۔

''بیٹا ہمیں گھر لے چلو۔ ہمرا آخری رسم وہیں کر یہو۔ قریب رہنے پر تم لوگ کبھی کبھی ہمری مزار پر آجیہو۔ نہیں تو اتنی دور کون آیے خاص کر۔''

ایک دن فون پر میں نے چھوٹے بھائی سے ان کی موت کی خبر سنی۔ اچانک آنکھوں میں آنسو تو نہیں آئے۔ مگر بڑی بے چینی رہی۔ رہ رہ کر ان کی آواز، انکا چہرہ ان کی زندگی کی

جدوجہد نگاہوں میں گھوم جاتی۔ ان کی یاد لگاتار ستانے لگی۔

میں گم سم سی ہوگئی۔ گھر کے کام کرتی اور پھر انہیں کی سوچ میں ڈوب جاتی۔ جب آنکھوں سے زار زار آنسو بہہ گئے تب من کا بوجھ ہلکا ہوا۔

میں نے ابّو سے پوچھا کہ —

''آپ کو معلوم تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ تو آپ نے بتایا کیوں نہیں۔''

''تم ان کی حالت دیکھ کر برداشت نہ کر پاتی۔ اسی لیے نہیں بتایا اور تمہیں لے کر پٹنہ جلدی سے آگئے۔''

اور آگے یہ بھی بتایا کہ جاڑے کی ٹھٹھرتی رات میں ان کا لڑکا ساری رات ٹھیلہ چلا کر میت کو غازی پور لایا تھا۔ کیوں کہ ان کے پاس اتنے روپیہ نہیں تھے کہ ریزرو گاڑی کر کے میت کو لاتے۔

ان کی موت سے ہمارے گھر کے سبھی لوگ غمگین تھے۔ ان کے جنازے میں کافی تعداد میں محلے کے لوگ جمع ہوئے تھے۔

آخر وہ ہماری کون تھیں؟

■■

گرودَ کشِنا

ماں کو کتاب تھماتے ہوئے نادرہ دھیمے لہجے میں بولی—

''ڈگری کمپلیٹ ہوگئی اماں۔''

شاداں وفرحاں ماں نے دونوں ہاتھوں سے کتاب کو اس طرح سنبھالا جیسے کوئی کسی مقدس کتاب کو پورے احترام کے ساتھ سنبھالتا ہے۔ کتاب کو احتیاط سے ایک طرف رکھ کر ماں وفورِ مسرت میں اپنا آنچل پھیلا کر پروفیسر کے لیے دعائیں مانگنے لگیں۔

بیٹی کی اس کامیابی پر آج وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ نادرہ کے سر کو گود میں رکھ کر شفقت بھری انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں—

''آج میرا سپنا پورا ہوگیا۔''

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری نادرہ کی منزل نہیں تھی۔ بلکہ راستے کا ایک پڑاؤ تھا جہاں پہنچنے میں اس کے قدم کتنی بار لہولہان ہوئے تھے اور نہ جانے اس سفر میں اس کا دامن کتنی بار خاردار جھاڑیوں میں الجھا تھا۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹی نادرہ کے ذہن کی وادیوں میں اس سفر کے دوران پیش آئے تلخ تجربات کی یادوں کا کارواں رقص کرنے لگا۔

پانچ سال قبل کی بات ہے۔ ڈیپارٹمنٹ کی چند لڑکیاں یونیورسٹی کیمپس میں محوِ گفتگو تھیں۔ اسی دوران پروفیسر صاحب قریب سے گذرے تھے۔ آگے بڑھ کر اس نے سلام عرض کیا۔ جواب دینے کے بعد دھیمی آواز میں بولے—

''سب ٹھیک ہے نا! کوئی دشواری تو نہیں؟''

''جی سب ٹھیک ہے۔'' نادرہ نے جواب دیا اور وہ آگے بڑھ گئے۔

''آپ لوگوں کی تمام سمسیا کا سمادھان ان کے پاس ہے۔ سر کبھی ہم لوگوں کا حال چال نہیں پوچھتے ہیں۔'' ان لوگوں کے ساتھ کھڑے کلیان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ کلیان کے اس جملے پر سارا ماحول قہقہہ زار بن گیا۔

حقیقت میں بات بھی کسی حد تک صحیح تھی۔ یونیورسٹی کیمپس میں کسی بھی شعبہ کی لڑکی اگر پروفیسر موصوف کو دکھائی دیتی تو اسے روک کر اس کی خیریت دریافت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس دور میں جہاں ہر شخص اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہے اور اعلیٰ عہدے دار اپنے عہدے کے سحر میں مگن ہیں وہاں اس قسم کی ہمدردی کسی بھی نازک دل کو متاثر کئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔

ایک بار کلاس کے باہر پروفیسر سے نادرہ کی ملاقات ہوئی۔ سلام علیک کے بعد بولے—

''ملاقات ہونی چاہئے۔'' وہ سمجھ نہیں سکی کہ پروفیسر صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ملاقات تو ہو ہی رہی ہے۔

نادرہ ان کے ہی شعبہ کی ایک طالبہ تھی۔ جو بیوہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد نادرہ نے ماں سے کہا۔

''اماں اگر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتی ہوں تو کسی بھی کالج میں لکچرر ہو سکتی ہوں۔ مجھے آپ کی اجازت چاہئے۔'' ماں خاموش رہی۔

ریسرچ ورک میں کافی دشواری ہوتی ہے، یہ بات نادرہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے باوجود اس پر ایک ہلکی سی دھن سوار تھی۔

ایک دن پروفیسر نادرہ کے گھر آپہنچے اور کہنے لگے—

''ادھر سے گزر رہا تھا سوچا نادرہ سے پوچھ لوں کہ اس کا پی ایچ ڈی کرنے کا کیا پروگرام ہے۔''

ماں نے مسکرا کر پروفیسر کی باتوں کا خیر مقدم کیا۔

''نادرہ تو آج بھی پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتی ہے۔''

ماں کے اس جملہ سے پروفیسر کو تقویت ملی۔ پاس کھڑی نادرہ کو میٹھی جھڑکی دیتے ہوئے پروفیسر نے کہا۔

''یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ذرا سی دشواری آنے پر تم لڑکیاں گھبرا جاتی ہو۔ محنت، مشقت، دوڑ دھوپ سے گھبرانا نہیں چاہئے۔''

پھر تھوڑا رک کر بولے۔

''بقیہ مدد کے لیے میں تو ہوں ہی۔ ایک بڑا کام ہو جائے گا اللہ نے چاہا تو نوکری بھی ہو جائے گی۔ تب زندگی کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔''

پروفیسر کی باتوں کا بیٹی سے زیادہ ماں پر اثر ہوا۔ انہوں نے بیٹی سے کہا۔

''جب پروفیسر صاحب مدد کو تیار ہیں تو کیوں نہیں کام شروع کر دیتی۔''

پروفیسر ماں کو خالہ کہہ کر پکارنے لگے۔ ماں کا دل باغ باغ ہوا تھا۔ انہوں نے اتنی جلدی ماں سے ایسی قربت بنالی کہ وہ انہیں اپنا بیٹا ماننے لگیں۔

اب نادرہ کو ریسرچ ورک کی تمام سہولیات بآسانی دستیاب ہو رہی تھیں۔

لیکن کچھ ہی دنوں بعد پروفیسر کی مصنوعی مصروفیت بڑھ گئی۔ پروفیسر کے اس رویہ سے نادرہ کے دل و دماغ میں احساس محرومی پروان چڑھنے لگی۔ اس طرح ریسرچ ورک اب تعطل کا شکار ہونے لگا۔ نادرہ کو سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ پی ایچ ڈی پوری ہو گی بھی یا نہیں۔ سر سے بیسوں بار مل چکی تھی۔ لیکن انہیں فرصت ہی نہیں۔ سات آٹھ مہینے گزر گئے۔ انہوں نے ورکس کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔ جبکہ انہوں نے ریسرچ ورکس ڈیڑھ سال میں پورا کرنے کا یقین دلایا تھا۔

ادھر نادرہ کی ممانی شادی کے لیے ضد کر رہی ہیں۔ اگر شادی ہو گئی تو پتہ نہیں پھر فرصت ملے گی یا نہیں۔ وہ کافی پریشان تھی اور اندر ہی اندر شکست و ریخت سے دوچار ہو رہی تھی۔

ناامیدی کے گھنے سایہ کو چیرتی ہوئی ایک دن مسرت کی قندیل اس وقت روشن ہو گئی

جب ایک شام پروفیسر موصوف نادرہ کے گھر تشریف لائے۔ اس بار ماں سے زیادہ نادرہ خوش ہوئی۔ اسے لگا اس کی بانہوں میں پنکھ لگ گئے ہیں اور وہ اڑ رہی ہے۔

ریسرچ ورک کے لیے پروفیسر کی فکر میں پہلے جیسی گرماہٹ تھی۔ بلکہ سردی کے اس موسم میں ان کے اندر ایک ایک الفاظ الاؤ کا کام کر رہے تھے۔

پروفیسر نے ماں سے کہا—

''نادرہ کو ریسرچ ورک کے سلسلے میں باہر جانا ہوگا۔ دو چار لائبریریوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔''

نادرہ چائے کا پیالہ دوبارہ لے کر اندر آ چکی تھی۔ ماں گھبرا گئی۔ اور کہنے لگی—

''میں بیوہ بے کس کنواری لڑکی کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ اگر کہیں جائے بغیر کام ہو جاتا تو بڑا اچھا تھا۔'' ماں کے الفاظ میں التجا تھی۔

''گھبرائیے نہیں خالہ۔ اصل میں اتفاق سے میرا بھی اس شہر میں ایک ضروری کام نکل آیا ہے۔ اگر آپ نادرہ کو لے کر میرے ساتھ چلیں تو کام آسان ہو جائے گا۔ اور جلدی ہوگا۔''

کام جلدی ہوگا...... اس کا مطلب ان کی گردش بھی جلدی کٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر ماں سنہرے مستقبل کے خوابوں میں کھوگئی۔ نا کہنا اب مشکل ہوگیا۔ جب بیٹے جیسا ذمہ دار پروفیسر ساتھ ہو تو انہیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں اور بیوی بچوں والا آدمی تو قابلِ اعتماد ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ہی ہفتہ وار نمازی، بات بات پر اللہ کی گواہی دینے والا ایسے شخص پر کون بھروسہ نہیں کرے گا۔

پروفیسر صاحب نے لکھنؤ جانے کا پروگرام بنایا۔ ایک راجدھانی سے دوسری راجدھانی۔ ایک السائی شام کے بعد رات کا سفر۔

رات کی تاریکی اور سناٹے کو چیرتی ہوئی ٹرین تیز رفتاری سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ نادرہ کا دل رہ رہ کر دھڑک اٹھتا۔ بار بار خیال آتا۔ پروفیسر اس پر اتنا مہربان کیوں ہے......؟ ماں کی پریشانی کے سبب یا اس کی کوئی اپنی غرض چھپی ہے؟ پھر خیال آیا کہ بے وجہ کسی پر شک کرنا گناہ ہے۔

ممانی چلاتی رہیں کہ نادرہ کا بیاہ کردو۔ لیکن اس کی ماں نے ایک نہ سنی۔ دراصل ماں نہیں چاہتی تھی کہ اس نے خود جو زندگی کا کرب جھیلا ہے۔ وہ نادرہ بھی جھیلے۔ پڑھی لکھی نہ ہونے کے سبب ہی تو آج شوہر کے انتقال کے بعد سے میکے کی دہلیز پر چھوٹے بھائی کے سہارے محتاجی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

رات کا سفر طے کر کے وہ لوگ لکھنؤ پہنچے۔ ایک رشتہ دار کے یہاں ٹھہرے۔ اس گھر میں ایک ضعیف عورت ایک جوان خوبصورت بیٹی ایک نوکری پیشہ بیٹا تھا۔ یہ دونوں پروفیسر کو ماموں کہہ رہے تھے۔

ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد پروفیسر نے کہا—

''خالہ! آپ آرام کیجئے۔ میں نادرہ کو لائبریری لے کر جا رہا ہوں۔ کام آج ہی سے شروع کرنا ہوگا۔''

پہلے وہ نادرہ کو لے کر کسی شناسا کے گھر گئے، جہاں ان کی خاطر تواضع ہوئی۔ وہاں سے نکلتے ہوئے شام ہوگئی۔

اودھ کی سہانی شام جو ہلکی بوندا باندی سے بھیگ گئی تھی، انتہائی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نادرہ کو لے کر کافی ہاؤس میں داخل ہوگئے۔

قندیل کی ہلکی زرد روشنی میں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ نادرہ خاموش تھی۔ اسی اثنا میں پروفیسر کا ہاتھ نادرہ کے ہاتھ کو چھو گیا۔ نادرہ نے ہاتھ ہٹا لینا چاہا۔ تو پروفیسر کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اس طرح کا پیار بھرا لمس ایک بار صادق سے ملا تھا۔ پروفیسر نے لمس کے ساتھ ہی معنی خیز انداز میں نادرہ کو سمجھانا چاہا۔

''اودھ کی شام بڑی سہانی ہوتی ہے۔ اس کا بھرپور لطف لو۔ ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔''

''بار بار نہ آئے تو اچھا ہے۔'' نادرہ کے دل نے کہا۔

نادرہ نے سوچا۔ ''یہ کوئی میرے خوابوں کا شہزادہ تو ہے نہیں کہ میں اس کے ساتھ

انجوائے کروں؟''

کافی ہاؤس کے باہر لکھنؤ شہر کی دودھیا روشنی میں نہائی رات کی جگمگاہٹ اسے خوابوں کی حسین دنیا میں لے گئی۔ وسیع اور صاف ستھری سڑکیں، خوشگوار ہوائیں...... کتنا فری محسوس کر رہی تھی وہ...... کوئی بندش نہیں...... بس کمی تھی تو صرف ایک من چاہے ساتھی کی۔

بس اس کی ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی جو اسے پروفیسر کا ساتھ دینے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ لیکن اب ایک اندیشہ بھی اسے پریشان کئے جا رہا تھا۔

رات کے کھانے کے دوران پروفیسر نے کہا—

''خالہ! سوچ رہا ہوں کہ آپ لوگوں کو امام باڑہ اور چڑیا گھر وغیرہ گھما دوں۔'' پروفیسر کا چہرہ کھلا تھا۔

نادرہ اداس تھی۔ غیر مطلوبہ لمس اسے لطف نہیں دے سکا تھا۔ اگلے دن سب لوگ امام باڑہ گھومنے گئے۔ یوں تو امام باڑہ کی اصلی رونق محرم کے دنوں میں نظر آتی ہے۔ مگر عام دنوں میں بھی جمعرات کے دن اچھی رونق رہتی ہے۔

لوٹتے وقت حضرت گنج میں سب نے آئس کریم کھائی اور خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

سیر و سیاحت کی تھکاوٹ کے سبب رات کا کھانا کھانے کے بعد جلد ہی سبھی لوگ اپنے اپنے بستر پر پہنچ گئے۔ پروفیسر کو مہمان خانہ ملا جس میں اٹیچ باتھ روم بھی تھا۔ دوسرے سٹے ہوئے کمرے میں نادرہ کو صبا کے ساتھ ٹھہرایا گیا تھا۔

رات جب شباب پر پہنچی تو پروفیسر نے صبا کو بلا کر نادرہ کو بھیجنے کے لیے کہا۔'' نادرہ کو بھیج دو کچھ کام کر لیں۔ صبح موقع نہیں ملے گا۔''

صبا کے کہنے پر نادرہ کو مجبوراً آنا پڑا۔ پروفیسر نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ پروفیسر اپنے بیڈ پر دراز تھے۔ نادرہ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔

پروفیسر نے کہا—

''نادرہ میرے سر میں درد ہے۔ ذرا مالش کر دو۔''

بیچاری نادرہ سرہانے بیٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کئے

لیٹے رہے۔

چند لمحوں بعد وہ اچانک اٹھ بیٹھے اور بولے۔

''نادرہ میں وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ میں تم کو پسند کرتا ہوں......تم سمجھ رہی ہو نا؟''

اس گفتگو کے دوران وہ اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔

نادرہ گھبراہٹ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی کہ...... ''لیکن سر! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ بیوی بچوں والے آدمی ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اپنے بستر پر جا کر تکیہ میں منہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے پکا ارادہ کیا کہ وہ پروفیسر کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اور صبح کو اماں سے کہہ دے گی کہ اسے پی ایچ ڈی نہیں کرنا ہے۔

اگلی صبح ماں کی دعاؤں کے ساتھ شروع ہوئی۔ نماز اور تلاوت کے بعد وہ پروفیسر کو پھونکنے اور دعاؤں سے نوازنے ان کے پاس چلی گئیں۔ ماں کے جانے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلے اور ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ شاید ان کی نگاہیں نادرہ کے چہرے کو پڑھنا چاہتی تھیں۔

رات کی باتوں سے اس کا وجود ہل سا گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تو شاید پروفیسر اپنے ناپاک منصوبہ میں کامیاب ہو جائے۔

کئی دنوں تک کوئی بات نہیں ہوئی۔

ایک ٹھنڈی دوپہر کو جب وہ اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی تھی۔ پروفیسر گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے کا زاویہ بدلا ہوا تھا۔ نادرہ کو دیکھ کر قدرے سخت لہجہ میں بولے۔

''تمہارا کام تقریباً پورا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے ایک اسٹوڈنٹ کو دے کر پورا کرایا ہے۔''

اسے محسوس ہوا کہ میری ڈگری آنسوؤں سے لکھنے سے بچ گئی۔ تبھی پروفیسر نے کہا۔

''چل کر دیکھ لیتے ہیں۔''

''ہاں بیٹی جا کر دیکھ لو۔'' ماں خوشی سے نہال تھیں۔ نہ چاہ کر بھی اسے جانا پڑا۔

وہ دونوں ایک صاف ستھرے رہائشی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک روم میں اپنا بیگ کھول کر پروفیسر نے اسے مکمل کتاب کی شکل میں ٹائپ کی ہوئی تھیسس تھمائی۔ اور اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ ''سمجھتی کیوں نہیں۔ اب یہ جمع ہو جائے گی۔ پھر ڈگری ملتے ہی تمہارا کیریر سنور جائے گا۔''

اس جملے کے ساتھ ہی پروفیسر نے اسے بستر پر دراز کر دیا۔ وہ کہتی رہی۔ ''سر مجھے اچھا نہیں لگ رہا، بالکل اچھا نہیں۔''

''اچھا لگے گا۔ محسوس کر کے دیکھو۔''

اب وہ اس کے جسم پر اس طرح چھا گئے جس طرح چاند پر کالے بادل چھا جاتے ہیں۔

■■

صبح کی شام

غروب آفتاب کے بعد کی ایک گھڑی بیت چکی تھی۔ تبھی کچھ لوگ دروازہ کھٹکھٹانے کے ساتھ ہی نہال کے پُل سے گر جانے کی خبر لے کر آئے۔

صبا کو یقین نہیں ہوا۔

امّاں کمرے سے یہ خبر سن کر دوڑتی بھاگتی آئیں۔ دوبارہ یہی بات سن کر سن رہ گئیں۔

نہال کے وہ الفاظ جو اس نے سویرے جاتے وقت صبا سے کہے تھے۔ ذہن میں گونجنے لگے۔

''ٹھیک ہے، ہم جا رہے ہیں، واپس گھر نہیں آئیں گے۔''

''آؤ گے نہیں تو جاؤ گے کہاں؟'' صبا نے پلٹ کر جواب دیا تھا۔

''کہیں بھی جائیں گے، مگر یہاں نہیں آئیں گے۔ میری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ اب رہنا مزے میں۔''

نہال نے یہ باتیں تو غصّے میں کہی تھیں، پہلے بھی کہہ چکا تھا۔ لیکن آج سچ مچ گھر آنے کے بجائے کہیں اور چلا گیا۔ اسپتال پہنچ گیا۔

گھر کی نااتفاقی کا کتنا خطرناک نتیجہ سامنے آیا۔ گھر کے افراد اطلاع پا کر چلے گئے۔ اماں بھی۔

صبا کے دماغ میں بیتی باتیں شور مچانے لگیں۔

صبا کو نہال سے آج بھی یہی شکایت تھی کہ وہ تنخواہ کا روپیہ اس کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔ شادی کے سات برس کے اندر نہ جانے کتنی بار اس بات کے سبب من مٹاؤ ہو چکا ہے۔

خاموش اور سنجیدہ مزاج نہال شروع میں صبا کی باتیں سن کر خاموش رہ جاتا تھا۔ بعد میں ایک ہی بات کو لے کر جھگڑا بڑھا تو نہال نے بھی بولنا سیکھ لیا۔

پہلے تو اس نے سمجھایا۔

''اماں شروع سے ہی گھر چلاتی آرہی ہیں۔ ہم سب کو چاہئے کہ ان کا اختیار ان سے نہ چھینیں۔ ان کے جیتے جی ہم ایسا نہیں کریں گے۔''

''تو کیا ہمیں چین سے جینے کے لیے ان کے مرنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

صبا نے جواب دیا تو وہ بوکھلا گیا۔

صبا اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتی تھی۔ جہاں گھومنے پھرنے کے لیے ساس کی اجازت پر منحصر نہ رہنا پڑے۔ گھر کا ماحول اسے کشیدہ اور حکم کی بیڑیوں سے جکڑا ہوا لگتا۔

اس کے تین بیٹے ہوئے، سب میں اماں کا دخل تھا۔ پرورش پڑھائی لکھائی سب ان کی مرضی سے۔ نہال کبھی ماں کو دیکھتا کبھی بیوی کو۔ اور بڑی بھاوج کی مثال دے کر سمجھاتا۔

''بھابھی اعتراض نہیں کرتیں۔ اماں کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ خدمت کرتی ہیں اور دعائیں بٹورتی ہیں۔'' اس پر صبا جواب دیتی۔

''وہ گاؤں دیہات کی ہیں۔ انپڑھ بھی ہیں، انہیں کیا پتہ زمانہ کتنا ماڈرن ہو گیا ہے۔ اس طرح ساتھ رہنے میں مستقبل نہیں سنورے گا۔ میں پڑھی لکھی ہوں، کیسے گھر چلتا ہے، میں جانتی ہوں۔'' اس کے ایسے جواب سے نہال کبھی بگڑتا کبھی خاموش رہ جاتا۔

بڑے بھیا ابا کی زندگی میں ہی نوکری سے لگ گئے تھے۔ ابا کی نوکری ان کے مرنے کے بعد چھوٹے کو دلا دی گئی۔

نہال نے جب بجلی آفس میں اپنے عہدے پر جوائنگ دی تو اسے بڑا ڈر لگا۔ بجلی سے وہ ڈرتا تھا۔ اسی بے جا ڈر نے اسے کھمبے پر سے گرا دیا۔

آج جب وہ بجلی کے پول پر چڑھا تو کسی نے دشمنی میں یا مذاق میں یا اپنی غلطی سے ہی ٹرانسفارمر آن کر دیا۔ ٹرانسفارمر کے جھٹکے سے وہ گر پڑا۔ اور بری طرح زخمی ہو گیا۔

بجلی کے پول پر جب بھی وہ چڑھتا، اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ کر اپنی سلامتی کی

دعائیں ایک بار ضرور مانگ لیتی تھیں۔

اپنے ساتھیوں سے کئی بار پوچھ لیتا کہ ٹرانسفارمر سے لائن نہیں دی ہے نا! تب جا کر کہیں وہ تاروں کو جوڑتا، ٹھیک کرتا۔ جس کسی دن بھی وہ پول پر چڑھ کر آتا تو سوچتا کہ صبا اس سے پوچھے تو وہ بتائے کہ اسے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اور ڈرتے ڈرتے بھی وہ کام کر لیتا ہے۔ جب اترتا ہے تو کیسی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اور اگلی صبح پھر اسی کام کے لیے تیار۔

لیکن صبا دن بھر کی روداد کبھی نہیں پوچھتی۔ یہ باتیں اس کے بھیا دلچسپی سے سنتے۔

نہال اور صبا کے بیچ ایک ہی لڑائی باقی رہ گئی تھی

''روپیہ میرے ہاتھ میں دو گے یا نہیں۔''

اب ان باتوں کو سوچ کر دل کی گہرائیوں سے آہ نکلی۔ اور گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ دل غم سے بھر گیا۔

نہال دو ڈھائی سال تک اسپتال کی کھاٹ پر موت اور زندگی سے جوجھتا رہا۔ اس کا چہرہ اور جسم دیکھ کر ڈر لگتا۔ اس کی خدمت بڑے بھیا کرتے اور بھابھی۔

صبا دروازے کے باہر سے دیکھ کر واپس آجاتی۔ اس کے پاس دیکھنے یا خدمت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

بھابھی پلنگ کے پاس بیٹھ کر سوپ پلاتیں، کھانا کھلاتیں اور دل ہی دل چھوٹے کے لیے روتیں اور دعائیں کرتیں۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی زندگی چند دنوں کی ہے۔ پھر بھی دعائیں کرتیں کہ وہ زندہ رہیں۔ چاہے زندگی بھر پلنگ پر ہی رہیں۔ ہم ان کی خدمت کر لیں گے۔

موت اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کوشش اور گھر کے لوگوں کی دعائیں اپنی طرف۔ اسی کھینچا تانی میں زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔

مرنے والے کی آخری رسوم و دیدار کے وقت سبھی رو پڑے۔ بڑے بھیا پر تو جیسے غم کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا تھا۔

غم کی چوٹ پر وقت کا مرہم لگتے ہی سب کچھ معمول پر آ گیا۔

اماں نے گرہستی کے بارے میں فکر چھوڑ دی۔ بیٹے کا غم ان کے مکمل وجود کو ڈھک چکا تھا۔

بڑے بھیا نے ساری ذمہ واری اپنے اوپر لے لی۔ ان کی نظر میں بہو کا مان بڑھ گیا تھا۔

بھائی کی امانت اور گھر کی عزت سمجھ کر وہ اسے سر آنکھوں پر بیٹھائے رہتے۔

ان کے جذبات کو اس وقت ٹھیس پہنچی جب بہو نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''آپ چاہتے ہیں ہم اپنے بچوں کے لیے آپ کے رحم و کرم کے محتاج بنے رہیں۔ آپ میری جوائنگ کا بندوبست کرا دیں۔''

بڑے بھیا نے ویسا ہی کیا۔

اب وہ آفس جانے لگی۔ دل پریشان نہیں تھا۔ حالات کا سامنا اس نے بہ آسانی کیا۔ کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

صبا نے تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ چولہا الگ کر لیا۔ گھر کے کام اور بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے نوکرانی رکھ لی۔

اب وہ کہیں بھی آسانی سے آجا سکتی تھی۔

سب کچھ اپنے ہاتھ میں آجانے کے بعد اس نے جیٹھانی سے تعلقات خوشگوار بنا لیے۔ بچے آنگن پار کر کے ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتے تو وہ بلانے کے بہانے جا کر بیٹھ جاتی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔ بچوں کے لیے کوئی سامان لاتی تو دکھانے ضرور جاتی۔ مگر جیٹھ کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی۔

اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ زندگی میں ادھورا پن تھا۔ جسے وہ خود ہی پورا کرنے کی کوشش کرتی۔

پھر بھی اسے یہ کمی کھلی نہیں۔ اسے کسی موقع پر شوہر کو یاد کر کے روتے کسی نے نہیں دیکھا۔

برسوں بیت گئے۔

بہت کچھ بدل گیا۔

بڑے بھیا اپنے بیٹے کا بیاہ کر رہے ہیں۔

آج جیٹھانی کے گھر ابٹن کی رسم ہے۔

صبا بھی تیار ہو کر خوشی خوشی گئی۔

جب کچھ عورتیں ابٹن چھوا چکیں تو وہ بھی چچی ہونے کے ناطے آگے بڑھی۔ تبھی اس نے سنا کہ سہاگنوں کو پکارا جا رہا ہے۔

بغل میں کھڑی عورت نے گردن کے اشارے سے منع کیا تو بھیڑ میں ہی سرک کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

اس کا دل کہنے لگا۔ 'میں ابھاگن تو اس شبھ گھڑی سے محروم ہوں۔'

افسردہ دل کے ساتھ وہ گھر کو لوٹ گئی۔

اگلی صبح اس نے پرانے بکس کھولے۔ جس میں اس کی شادی کے گہنے، رنگ برنگی ساڑیاں گوٹے لگے دوپٹے اداس پڑے تھے۔ برسوں سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ سوچنے لگی۔ اب یہ میرے کسی کام کے نہیں۔ ہاتھ تھر تھرا گئے۔

دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔

آج پہلی بار اسے اپنے ادھورے پن کا احساس ہوا۔ شدت سے نہال کی یاد ستانے لگی۔ تب سے اس کی خوشی پر اداسیوں کا پہرا لگ گیا۔ مہینوں اداسیوں میں ڈوبی رہی۔

اب تک کے اچھے کاموں میں یہی ایک ہوا تھا کہ آنگن میں دیوار نہیں اٹھی تھی۔ نہ ہی صبا نے اس کے متعلق کوئی تذکرہ کیا۔

جیٹھ کا آس پاس کے علاقے میں اچھا رعب داب تھا۔ اس لیے کسی نے اس گھر کی طرف آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھیں۔ ورنہ مرد کا سایہ سر سے اٹھتے ہی کتنی بد نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کی اچانک ہنسی اور مسکراہٹ پر لگے پہرے سے سبھی فکر مند ہوا تھے، اندازہ ہوا کہ وہ بیمار ہے۔

شام کو گھر آنے کے بعد نگاہیں باہری دروازے کی جانب اٹھ جاتیں اور دیر تک

جمی رہتیں۔

بیماری کا سن کر اس کی بھاوج دیکھنے آئیں۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد بغیر کچھ بولے اس نے اپنا بکس کھول دیا۔ نگاہوں میں خاموش سوال تھا—

''اب ان کا کیا ہوگا؟''

دیکھ کر بھابھی مسکرائیں پھر بولیں—

''تم ان گہنوں کی فکر کر رہی ہو، یہ سب تمہاری بہو کے کام آئیں گے۔ ہاں تمہاری بہو کے۔''

سن کر وہ بھی مسکرا دی۔ ''میں نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔''

اور پھر ''بھابھی تم کتنی اچھی ہو۔'' کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔

■■

بابُل کا دوار

جس وقت شبو میکے پہنچی، تو اسے آتے دیکھ کر چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی چہک اٹھے۔

''آپی آگئی، آپی آگئی'' کی پکار کے ساتھ ہی پاس پڑوس میں بھی خبر پہنچ گئی۔ لیکن ماں کا چہرہ اتر گیا۔ کیوں کہ جب بھی وہ آتی ہے کسی سامان کی فرمائش کر کے ہی جاتی ہے۔ اس بار ماں نے دل کو سخت کر کے سوچ رکھا تھا کہ اتنا کھرا کھوٹا کہہ دوں گی کہ وہ ناراض ہو کر چلی جائے تا کہ کچھ دن تو اطمینان سے رہ سکوں۔

ماں چائے پانی کرانے کے بعد جب مطمئن ہوئی تو شبو نے کہا۔

''امی عید کے موقع پر ذرا اچھا کپڑا بھیج دیجئے گا، نہیں تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔''

''اس بار کپڑے نہیں بھیج پاؤں گی۔ تمہارے پاپا کا ہاتھ خالی ہے۔'' پھر شبو بولی۔

''نہیں امی! ایسا مت کیجئے گا۔ ورنہ آپ کے داماد کیا سوچیں گے ساس اور جٹھانی بھی برا مانیں گی، طعنے دیں گی۔''

''کچھ بھی ہو، میں نہیں بھیج پاؤں گی۔'' ماں نے جواب دیا۔

ماں نے مزید کہا۔

''پہلی عید کے موقع پر سب شوق پورے کر دئے۔ اب مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ تمہارا بیاہ کر کے میں بک گئی۔ اب تک قرض نہیں اترا۔ اس پر بھی کوئی تیوہار تو کبھی عید اور مہمان۔ تمہارے پہلے بچے کی پیدائش پر بھی کپڑے دے چکی ہوں۔ میوہ گھی مٹھائی کپڑے اور جانے کیا کیا بھیج چکی ہوں۔ تم کو ہی دیکھتی رہوں گی تو دوسری کی کیسے تیاری ہوگی۔''

سات بیٹیوں کی ماں — روز بہ روز نئی نئی پریشانیوں میں گھری رہتی۔ گاؤں میں بیٹی کا بیاہ کر کے اپنے لیے ایک اچھی خاصی مصیبت مول لی ہے۔ جس کسی کو کام ہوتا۔ جھٹ شہر چلا آتا۔ بازار کرنا ہو، کپڑے خریدنا ہو، ڈاکٹر کو دکھانا ہو یا کسی کو امتحان دینا ہو۔

ماں کا جواب سن کر بیٹی چونک پڑی۔ اسے ایسا تلخ جواب ملے گا۔ اس کی امید نہ تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد دو تین دن رک کر وہ واپس چلی گئی۔

ماں آنسو بہاتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔ بیٹی میکے سے روٹھ کر گئی، اس کا ملال تھا۔

''میں نے شاید نہایت ہی بے تکی بات کہہ دی ہے۔ اگر میں خوشحال ہوتی تو بیٹی کو اس طرح روٹھ کر جانے نہ دیتی۔'' ماں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ چھوٹی بچیوں کے اسکول سے واپس لوٹنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔

ایک دن منی (دوسری بیٹی) سہیلیوں کے ساتھ گھر آئی۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ تین بہنیں اور ایک بھائی ہے — ایک شادی شدہ، دوسری وہ خود اور تیسری اس سے چھوٹی۔ اس کے بعد بھائی۔

اسی وقت چھوٹی چھوٹی پانچ بہنیں انٹرول میں کھانا کھانے آگئیں۔ اتنی پیاری پیاری بچیوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک نے پوچھا —

''ارے یہ سب تمہاری بہنیں ہیں۔؟''

فوراً جواب ملا —

''محلے کی ہیں۔'' ماں ان بچیوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جب وہ سہیلیاں جانے لگیں تو بغل والے کمرے میں جھانک کر دیکھا جہاں سب بچیاں کھانا کھا رہی تھیں۔ امی پانی، امی دال، امی چاول کی رٹ لگا رہی تھیں۔

سہیلیوں کو مزید سمجھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ ان لوگوں کے چلے جانے پر ماں نے ڈانٹا۔ ''سہیلیوں سے تم جھوٹ کیوں بول رہی تھی۔'' بیٹی نے جواب دیا —

''اتنی بہنوں کے بارے میں بتانے میں شرم آتی ہے۔''

بیٹی کے الفاظ من میں چبھ گئے۔ بے ساختہ نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ ماں نے بیٹی کو شرمسار دل

سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''مجھ کو شرمندہ کیوں کرتی ہو۔؟'' منی چپ رہی۔

بے انتہا گھریلو ضروریات اور سنگھار کے سامان نہ فراہم کرنے کے سبب گھر کی بدتر حالت کو دیکھ کر اس کا دل کدورت سے بھر گیا۔ ماں اسی طرح مجبور تھی جس طرح موت کے دروازے پر کھڑا کوئی شخص لاچار اور مجبور ہوتا ہے۔

ماں اپنے فرائض کو پورا کرتے کرتے گھبرا گئی تھی وہ بیٹیوں سے منت کرتی کہ وہ اس کی عزت سے نہ کھیلے۔ بیٹی دل ہی دل مسکرا اٹھی۔

اس نازک موقع پر ایک حیرت انگیز خیال دل میں تیر گیا۔ اور ماں کا بے انتہا احترام لمحے بھر کے لیے اس دل سے اتر گیا۔

منی نے فوراً ایک فیصلہ کر لیا اور سامنے والے لڑکے کے ساتھ نکل پڑی — ایک خوشنما زندگی کا خواب پلکوں پر سجائے ہوئے۔

ماں اپنی کوکھ کو کوسنے لگی۔ بیٹی کی اس ذلیل حرکت سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وفورِ غم سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور بچوں کے لیے ماں کے وسیع دل کی محبت کے شرارے کجلانے لگے۔ بیٹی کی ممتا دل سے اترنے لگی۔

پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ ساری بیٹیوں کی شادی آسانی سے کر لیں گی۔ بیٹیاں خوبصورت ہیں خوبصورتی پر ہی اٹھ جائیں گی۔ لیکن خوبصورتی کی آڑ میں اس نے تو ذلیل ہی کر دیا۔ اسی لیے بیٹیوں کی پیدائش پر لوگ غم مناتے ہیں — ٹھیک ہی کرتے ہیں۔

ہفتہ دن مشکل سے گزرا ہو گا کہ ماں کو بخار آ گیا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ وہ منی کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔

دو دن بعد بخار تو اتر گیا مگر پلنگ پر ہی بیٹھی رہی۔ منی کا خیال آتے ہی دل بیٹھ جاتا۔ وہ دن رات اسی کے خیالوں میں ڈوبی رہتی۔

مہینوں بیت گئے۔

اچانک ایک دن منی گھر میں اکیلے داخل ہوئی۔ ماں کا چہرا کھل اٹھا۔ پھر اچانک چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔

وہ ماں کے آگے شرمسار ہو کر بولی۔

''امی! ہم جس خوشی کی تلاش میں گئے تھے وہ ہمیں نہیں ملی۔اب اگر ہمیں بابل کے دوار پر بھی ٹھکانہ نہیں ملا تو ہم خودکشی کر لیں گے۔''

ماں خاموش رہی۔

کئی دن خاموشی میں بیت گئے۔اس کو اس گھر نے دل سے قبول نہیں کیا۔اسے لگا میں بیکار ہی یہاں آ گئی۔ پہلے جیسی محبت اب مجھے یہاں سے ملنے والی نہیں۔ یہ سوچ کر وہ ماں سے رخصت ہونے کے لیے ان کے قریب آئی۔

''امی میں جا رہی ہوں۔ میں کہاں جاؤں گی، مجھے بھی نہیں معلوم۔لیکن یہاں اس گھر میں رہ کر مجھے لگتا ہے بوجھ بن گئی ہوں۔کوئی مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ میرا دل نہیں لگتا، گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ میں نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو مجھے زندگی بھر بھگتنی ہے۔اس لیے......''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ بڑے رحم سے وکرم سے آگے بڑھا کر بیٹی کے سر پر رکھ دیا۔بیٹی ماں کے سینے میں سماتی چلی گئی۔

■■

بندھن

چوکھٹ لانگھنے سے پہلے ہی اس کے قدم کسی کی معصوم آواز پر رک گئے۔ یہ آواز اس کے بیٹے کی تھی۔ اس آواز نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ پھر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی۔

وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ سالم نے اس کے سپنوں کا خون کیا۔ اس لیے اسے آج کسی بھی وقت یہ گھر چھوڑ کر چلے جانا ہے۔

عورت کیا چاہتی ہے اپنے لیے کسی مرد کا سہارا، سماجی و معاشی تحفظ۔ تا کہ وہ فکر فردا سے آزاد رہے اور تنہائی کے بے رحم لحات کا شکار نہ ہو۔ شوہر کی توجہ اور اس کی محبت، اس کے بدلے شوہر کی خدمت۔ ڈھیر ساری خدمت۔ یہی تو تمنا ہوتی ہے کسی لڑکی کی۔

سالم کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ ہر روز پیتا ہے۔ اس کا گھر سامنے ہی ہے۔ ٹھیک سامنے والا۔ شام کو دفتر سے لوٹ کر وہ سیدھے وہیں جاتا ہے چائے پینے۔ وہاں سے گھنٹوں بعد وہ گھر آتا ہے۔ شروع میں کئی کئی دن بعد۔ پھر دو دن کے وقفہ سے۔ پھر ایک دن۔ اور اب تو ہر روز بغیر وقفہ کے۔

علویہ سوچنے لگی، یہی تو بے وفائی ہے۔ سوچتے سوچتے الجھنوں میں مبتلا ہو گئی۔ بے وفائی لفظ کا سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ سوچتی۔ یہ سرا کہاں جا کر ختم ہوگا۔ ختم بھی ہوگا یا کسی کو ختم کر دے گا۔ کسی ایک کو ختم کر دے گا۔ کسی ایک کو ضرور برباد کر دے گا۔

لیکن کسے؟ اُسے یا سامنے والی دانیہ کو۔ جس کا شوہر تقریباً سال بھر سے باہر گیا ہوا ہے کمانے کے لیے۔ روزی روٹی کی خاطر اور جس نے علویہ کے شوہر سے اس کی دیکھ بھال بھی

کبھار کرنے کو کہا تھا۔

علویہ اور دانیہ اچھی دوست تھیں۔ لیکن آج اسی دوست نے اس کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ چھین کر ہی تو ہر روز اس کے ساتھ اپنے اکیلے پن کو بانٹتی ہے۔

گھر کی ساری ذمہ داری سالم کو دے رکھی ہے۔ سودا سلف لانا، بچوں کی دیکھ بھال کرنا، بازار گھومنا، بینک سے روپیہ نکالنا وغیرہ وغیرہ۔

اور اب تو حد ہو گئی کہ اس کا دل بہلانے لگا ہے۔ اسے لے کر مارکٹ جاتا۔ سماج کے ڈر سے اسکوٹر کی بجائے رکشہ سے لے کر جاتا۔ علویہ یہ سب کیسے برداشت کرے؟

دانیہ کے حسن کا جادو اور دوستی کی چاشنی رنگ دکھانے لگی تو علویہ کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

دوسری صبح علویہ نے چائے کی پیالی سامنے رکھی اور اخبار دیکھنے لگی۔ سالم چائے پینے لگا۔ مگر علویہ خبروں کی بجائے اسے ہی مسلسل دیکھے جارہی تھی۔

گویا وہ کسی کا چہرہ پہچان رہی ہو۔ لیکن نام بھول گئی ہو۔ پھر اچانک اس کی سانس رک سی گئی۔ اس کے چہرے کے سامنے دانیہ کا چہرہ ناچنے لگا۔ وہ چیخ پڑی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''دیکھو! آج سے تم دانیہ کے گھر نہیں جاؤ گے۔ تمھیں اس کے گھر نہیں جانا چاہئے۔ اب سے تم وہاں نہیں جانا، ورنہ۔''

''ورنہ، ورنہ تم کیا کر لوگی؟'' کہتے ہوئے سالم نے ایک زوردار طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا اور اس کا ردعمل دیکھے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔

علویہ تلملا اٹھی۔ اسے سالم سے قطعی ایسی امید نہیں تھی۔ گھنٹوں وہ روتی رہی۔ علویہ نے سوچا اسے اس گھر سے چلے ہی جانا چاہئے تا کہ وہ اپنے آپ کو کڑھنے سے بچالے۔ اور پھر تھوڑے سے ضروری سامان کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

اس تیاری اور فیصلے میں وہ اپنے ڈھائی سال کے معصوم بیٹے کو بھی بھولی ہوئی تھی جو ابھی ٹھیک سے بول بھی نہیں پاتا تھا۔

وہ پلنگ پر بے خبر سو رہا تھا۔

اور علویہ ہاتھ میں سامان لیے ابھی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ بچے کے رونے کی آواز سن کر رک گئی، گویا وہ رکنے کی التجا کر رہا ہو۔ وہ پلٹ کر بچے سے لپٹ گئی، اسے چومنے لگی، پیار کرنے لگی۔

کچھ دیر اسے یونہی چومتی رہی۔ اور سوچتی رہی۔ اس کے قدم نہ آگے بڑھ رہے تھے نہ اس کے ہاتھ بیٹے کو اپنے سینے سے الگ کر پا رہے تھے۔ تب اس نے سوچا۔

نہیں! وہ اسے بے سہارا چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اس معصوم کا سب کچھ اس گھر میں ہے۔ اس کا ماضی، مستقبل اور حال سب کچھ۔ اس بندھن کو وہ نہیں توڑ سکتی۔ اس زنجیر کو وہ نہیں کاٹ سکتی۔

■■

چوکھٹ

اسے زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے۔وہ سامنے کھانا لیے بیٹھا ہے۔مگر گبرو کے سوکھے منہ کی یاد آئی اور بھوک مٹ گئی۔کافی دیر تک وہ کھانا سامنے لیے سوچتا رہا۔کیسے وہ اس کھانے کو گبرو کو کھلا دے۔اس کے دل میں گبرو کو دیکھنے کے لیے انجانا درد تڑپ اٹھا۔ایک پل میں ہی درد آنسو بن کر بہہ نکلا اور روٹی کی طرف بڑھے ہاتھ رک گئے۔اس کا پورا چہرہ کراہ اٹھا۔فضا بھی مانو خاموش ہو کر سسکنے لگی۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ ہونٹوں پر ایک سرد آہ پڑی تو اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔آنسو اندر ہی اندر گلے کو تر کرنے لگا۔اس نے پہلے اسے دل ہی دل اور پھر چیخ کر دھکارا۔جس نے اس کی ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔اس نے انہیں زور زور سے کوسا۔'میری آہیں— نہیں ہم سب کی آہیں انہیں ڈس لیں گی۔ہماری سسکیاں انہیں کھا جائیں گی۔ہمارے دل کی آگ ان سب کے گھروں کر جلا کر راکھ کر دیں گی۔

بوڑھی ماں تقریباً چیخ پڑیں۔

''ایسی بددعائیں نہیں دیتے بیٹا۔''

ماں نے فوراً ہی بیٹے کی تڑپ کا اندازہ کیا۔اور نرم لہجہ میں بولی—

''اتنا برا شاپ کسی کو نہیں دیتے بیٹا۔''

وہ بیٹے کے دکھ پر پھوٹ پڑی۔جنم جلوں نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا۔جوان بیٹے کے آنسو دیکھنے کے لیے۔کون سا پاپ کیا تھا میں نے۔

آج دو سے چار دن ہو گئے۔وہ ندی کنارے بیٹھا ہے۔گھر میں قدم رکھنے کی ہمت

نہیں ہو رہی ہے۔ بوڑھی ماں کھانا بنا کر لاتی ہے۔ مگر وہ نہیں کھاتا۔

وہ ندی کنارے بیٹھا کبھی ندی کی طرف تو کبھی گھر کی طرف دیکھتا ہے۔ گھر کی طرف دیکھتا ہے تو ماں اسے گھر میں بلاتی ہے۔ ایک ماں گھر میں بلاتی ہے، دوسری گود میں۔ جس کی گود میں وہ پچھلے بیس بائیس برسوں سے کھیل رہا ہے۔ جس کے صاف شفاف پانی میں جھینے پردے کو بچھا کر اپنی روزی سمیٹتا تھا۔ لیکن اب اسے کسب معاش کی ضرورت نہیں۔ اس کی خواہش مر گئی ہے۔ اس کی تمنا زندہ رہنے کی نہیں رہی۔

اس میں نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی ہمت ہے نہ ایک قدم پیچھے لوٹنے کی۔

کڑاکے کی سردی پچھلے تین دنوں سے اس کے اوپر سے گذر رہی تھی۔ ماں شام ہوتے ہی اسے گھر بلاتی۔ بلاتے بلاتے خود تھک کر وہیں چوکھٹ پر سر رکھ دیتی اور نیند میں ڈوب جاتی۔

ماں نے اسے دو عدد کمبل اوڑھنے کے لیے دیا تھا۔ جسے پچھلے برس وزیر اعلیٰ نے پٹنہ میں بانٹا تھا۔ اور وہ اپنی بہوؤں اور گوتنیوں کے ساتھ پٹنہ آ کر لے گئی تھی۔ اسے وہ کس کر لپیٹے رہتا۔ سردی کا جھونکا جب چہرے پر پڑتا تو اس کی روح تک کو پگھلا دیتا۔

وہ پتھر کی مورت بنا بیٹھا ہے۔ لیکن اس کے ذہن پر پچھلے دنوں کا سانحہ فلم کی طرح واضح تھا اور وہ بھیانک منظر رہ رہ کر نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔

وہ صبح سویرے دوا لانے شہر چلا گیا۔ ماں کو پیٹ کی دقت، معصوم بچہ کو بخار کی شکایت۔

یہ غریب لوگ گاؤں میں دوا دارو کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے کئی کئی دنوں تک سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ایک دن کے کام کا حرج کر کے وہ کیسے شہر جا کر دوا لائیں۔

جوان لوگ تو بیماری کو اپنے جسم پر جھیل کر اس کی مدت پوری کر لیتے ہیں۔ مگر بوڑھی ہڈیاں اور معصوم نازک جان کے لیے بغیر دوا کے بیماری جھیلنا ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

بھیکو شہر سے دوا اور راستے سے دودھ اور لکڑی کا بندوبست کر کے گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ بیوی نے بتایا کہ کراسن تیل کی زبردست قلت ہے۔ شہر سے لے آنا۔ ان تمام کاموں کے لیے وہ شہر چلا گیا تھا۔

کراسن تیل تو وہاں بھی نہ مل پایا۔
تب بوڑھی ماں پڑوس کی عورت سے چھوٹی شیشی میں چراغ کے لیے تیل لے کر آئی۔
گھر پہنچتے ہی بھیکو نے کھانا کھایا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔
آدھی رات کو بچہ کے جاگنے پر اس کی بھی نیند کھل گئی۔ اور وہ بچہ کو دودھ روٹی کھلانے بیٹھ گیا۔

اور پھر لمحہ بھر بعد کا سانحہ جب وہ بچہ کی طرح گڑگڑا رہا تھا—
''میرے بچے کو دودھ روٹی کھلا لینے دو تب مجھے مار ڈالنا۔''
گلا ریتنے کے لیے کیا گیا پہلا وار خالی گیا۔ جس سے وار کرنے والے کی کھسیاہٹ بڑھ گئی۔

باہر سے آنے والی گولیوں کی آواز سے بچہ سہم گیا۔ بچہ کی ماں کی تھرتھراہٹ بڑھ گئی۔ کانپتی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ بچہ کو گود میں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکی۔ تب اس نے اسے وہیں چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگنے والی پر نشانہ چوک گیا تو سب ایک جٹ ہو کر بھاگنے والی کے پیچھے دوڑے۔

ایک نے معصوم کی بانہیں پکڑ کر دروازے کے باہر اچھال دیا۔ وہیں جہاں عورت بھاگ رہی تھی اور جہاں دروازے پر دو لاشیں اسی گھر کی پڑی ٹھنڈی ہونے کو چھٹپٹا رہی تھیں۔ بچہ اوندھے منھ گرا جہاں تازہ گرم خون سے سنی زمین تھی۔ بچہ کے ہونٹ اور زبان خون سے سن گئے۔ خون کو چٹخارتا ہوا بچہ رو رہا تھا۔

دستے کے ایک شخص کو مذکورہ منظر اچھا لگا۔ دو منٹ رک کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ تبھی پیچھے کھڑے شخص کو موقع مل گیا اور تقریباً وہ سرکتے ہوئے تیسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بوڑھی ماں بیت الخلاء میں تھی۔ جو پیٹ خراب ہونے کے سبب شام سے کئی بار بیت الخلاء جا چکی تھی۔

دوسرا بچہ بھی بغیر کھائے سو گیا تھا اور اب اٹھ کر کھانے کے لیے مانگ رہا تھا۔
مشکل سے دو تین لقمہ کھایا ہوگا کہ تبھی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ

بڑھتی ہی گئی۔ پھر اچانک ہنگامے کے ساتھ ساتھ گولیوں کی آوازیں۔

ان آوازوں کے ساتھ ماحول بھی بھیانک ہوتا چلا گیا۔ اور پھر کئی گھنٹوں بعد سب کچھ شانت۔ صرف گریہ وزاری، صرف گریہ وزاری۔

صبح کی روشنی میں بوڑھی ماں کے چہرے پر دکھ اور آنکھوں میں آنسو تھا وہ لاشوں کو دیکھتی رہی اور اس کی آتما چیخ پکار کرتی رہی۔ 'بھگوان اگر ہے تو کوئی چمتکار کیوں نہیں ہو گیا۔ بھگوان تم سے اتنی بے رحمی کیسے دیکھی گئی۔ تشدد کا ایسا ننگا ناچ کراتے تمہارا دل کیوں نہیں کانپا۔ تم تو سب کے دل میں بستے ہو بھگوان۔ معصوم بچے تو تمہارے روپ ہوتے ہیں۔ بھگوان اپنے روپ کا ایسا دردناک انت۔ معصوم کلکاریوں کی ایسی دل سوز چیخ کیسے برداشت کر سکے بھگوان۔'

آنچل کو مٹھیوں میں بھینچ کر ماں سسکتی رہی۔ دو جوان بیٹے، تینوں بہوئیں اور خاندان کے درجنوں افراد پر باری باری آنسو بہاتی رہی۔

صرف ایک زندہ بچ گئے اپنے بیٹے کو اپنے بچے کی موت پر آنسو بہاتے دیکھ بوڑھی ماں کے دکھ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

پچھلے دنوں کی طرح آج بھی بوڑھی ماں نے پرات میں چوڑا رکھا۔ اس پر گڑ کے چور چھڑکے۔ لوٹے سے پانی ڈالا۔ جب چوڑا پوری طرح بھیگ گیا تو ماں ندی کنارے بیٹھے بیٹے کے پاس گئی۔

ایک ہاتھ میں پرات دوسرے میں پانی کا لوٹا لے کر آگے بڑھی۔ اس نے چار قدم کی دوری سے دیکھا کہ بیٹا اپنے بیٹے کی لاش کو کمبل میں چھپائے اس سے باتیں کر رہا ہے۔

اسے یہ لاش کہاں سے مل گئی۔ ماں سوچ میں پڑ گئی۔ ماں کو دیکھ کر اس نے جھپٹے سے تھالی ہاتھ سے چھین لی۔

''لاؤ میرے بچے کو کھلاؤ۔'' ماں سمجھ گئی بیٹے کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف دوڑی۔

چوکھٹ تک آتے آتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کی آواز فضا میں ان جملوں کے ساتھ

گونج کر شانت ہو گئی۔

'ہے بھگوان! ایک بار صرف ایک بار انہیں اور بھیج دو اس چوکھٹ پر، ہمارے جیون کا انت کرنے کو۔ ہمارے دکھوں کا انت کرنے کو۔

ایک بار بھگوان— صرف ایک بار۔

■■

جیت کا غم

مالتی کی گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ جب دن کی روشنی ختم ہونے کے بعد بھی بچیا گھر نہیں لوٹی تو اسے شبہ ہوا۔ ایسی صورت حال میں ایک ایک پل گزارنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ نتیجتاً گھبراہٹ میں لالٹین ہاتھ میں لیے دروازے سے باہر نکل گئی۔ زور زور سے خود ہی بڑبڑائے جا رہی تھی۔

''سارا سارا دن گرد و غبار میں کھیلتی رہتی ہے۔ لیکن سانجھ ڈھلتے ہی بچیا دروازے کے اندر چلی جاتی ہے۔''

مالتی گاؤں کی اندھیری گلی، اوبڑ کھابڑ راستہ سے پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھتے ہوئے سڑک پر پہنچ گئی۔

موسم باراں کی پہلی بوچھار پڑ چکی تھی۔

گھٹنوں تک اونچی مٹمیلی ساڑی، ننگے پاؤں کمزور جسم کے باوجود ہلکی کیچڑ میں سڑک پر تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔

سڑک پر گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ وہ لوٹ آئی۔

کہیں بچیا گھر آ تو نہیں گئی۔ لیکن بچیا کو گھر میں نہ پا کر غم میں وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پائی۔ وہ چلا چلا کر رونے لگی۔ جس سے پاس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔

اندھیرا مکمل طور پر زمین کو اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ مرد و عورت لالٹین لے کر کھیت کھلیان اور لاٹھی لے کر پگڈنڈی پار کرتے ہوئے شاہراہ پر جا پہنچے اور اس کے گڈھوں اور آس پاس کے نشیبی علاقوں میں بھی اسے تلاشنے لگے۔

گاؤں کے کچھ ہی فاصلے پر سڑک تھی ۔گاؤں کے بچے دن میں کھیلتے ہوئے سڑک تک پہنچ جایا کرتے تھے۔

گھنٹوں تلاشی کے بعد اچانک ایک گڈھے سے بچیا کو نکالا گیا۔ نکال کر پہلے چہرہ صاف کیا گیا۔اس کا چہرہ داغدار اور سکڑا ہوا تھا۔اس کے ماتھے پر خون نکل کر جم گیا تھا۔

چار سال کی معصوم چنچلتا خاموش ہوگئی تھی۔ مالتی کی چیخ فضا میں گونجنے لگی۔

گاؤں والوں کو جوگندر بابو کا وہ زوردار استقبال یاد آیا۔ جب گاؤں والوں نے مل کر ان کا ٹیکہ تلک کیا تھا وہ پہلی بار اس گاؤں سے کھڑے ہوئے تھے۔اور ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

''سب سے پہلے میں موت کے دہانے پر پہنچے اس گاؤں کے ہاسپٹل کو کارگر اور سرگرم عمل بناؤں گا۔تا کہ مینا بہو کی طرح دردِ زہ میں مبتلا علاج کے فقدان میں کسی اور کو جان نہ گنوانا پڑے۔ آپریشن کا انتظام بھی گاؤں میں ہوگا۔کسی کو بھاگ کر شہر نہیں جانا پڑے گا۔ساری سڑکیں ٹھیک کروادوں گا۔سارے گڈھے بھروادوں گا۔بجلی کی روشنی سے گاؤں کا چپہ چپہ چمک اٹھے گا۔ میں گاؤں کا نقشہ ہی بدل دوں گا۔''

ان کے خیالات اور نظریات سے گاؤں والوں کے دلوں میں امید وامکانات پیدا ہوگئے۔گاؤں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

سب نے متحد ہو کر ان کو ووٹ دیا اور وہ کامیاب ہوگئے۔

اب وہاں کے لوگ ان کا دیدار کر کے خود کو خوش قسمت سمجھنے لگے ۔جب کبھی وہ گاؤں آتے تو لوگ اپنے اپنے دکھڑے سنانے کو بے چین رہتے لیکن وہ اتنے لوگوں کے بیچ گھرے ہوتے کہ ان کے قریب ہی پہنچنا مشکل ہوتا۔اپنی مصروفیت ظاہر کرتے ہوئے پھر آنے کا وعدہ کر کے وہ لوٹ جاتے۔

اب وہ اکثر و بیشتر دہلی میں رہتے تھے۔

ایک دن وہ بھی آگیا۔ جب ان کی مدت کار ختم ہوگئی۔اور دوسری مدت کے لیے انہیں پھر اپنے انتخابی حلقہ میں آنا پڑا۔

اس بار انہوں نے گاؤں کے تعمیری کاموں کا نقشہ پہلے سے کاغذ پر بنا رکھا تھا۔ وہ وعدہ کر رہے تھے کہ اس بار جیتنے پر گاؤں کے سارے مسائل دور کر دیں گے اور گاؤں کی قسمت بدل جائے گی۔ یہ سارے وعدے ان کے منصوبے میں درج تھے۔

ان وعدوں پر یقین کرتے ہوئے گاؤں والوں نے اپنے مصروف لمحات کو پھر ایک بار وقف کر دیا اور انتخاب میں انہیں کامیاب بنا دیا۔

اس بار بجلی پردھان کی ڈیوڑھی تک آ گئی تھی۔ انہیں اب خاص لوگ ٹی وی پر بھی گفتگو کرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے لیکن مجموعی طور پر گاؤں کی جن ترقیات کا وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں ہو پایا۔ بالآخر ایک بار پھر انتخاب کا وقت آ گیا۔

اس بار لوگ ان کے اقرار اور وعدہ سے تنگ آ چکے تھے۔ گاؤں والوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ اسپتال کی غیر حالت کی وجہ سے خواتین کی موت، گندگی سے متعدد امراض کا پھیلنا، بلدیو کی ماں کی ریلی میں دب کر موت اور بوڑھے دینو کا کا جی ڈیڑھ ماہ بعد ریلی سے لوٹ پائے تھے۔

یہ سب اس لیے تھا کہ ایک بار ان کی مہربانی سے گاؤں میں بجلی پانی سڑک اور ہاسپٹل کا انتظام ہو جاتا تو ہماری نسل ان مسائل کی فکر سے آزاد ہو جاتی۔

تیسری بار بھی انہیں کا شور تھا۔ لیکن گاؤں والوں کے بیچ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس بار سارے لوگ متفق تھے کہ کسی بھی قیمت پر ان کو شکست دینا ہے۔

اس لیے لوگ نیتا جی کے ذلت آمیز استقبال کے لیے پہلے سے جمع تھے۔ گاؤں والوں نے اپنا ووٹ دے دیا۔

انتخاب کا نتیجہ دو چار گھنٹوں میں آنے ہی والا تھا۔

بدھن کا کی، جمن چاچا، سرجا بھیا، جوگدری چھکن، منگرودا پھولن، جھکا اور چھوٹی کا کی وغیرہ بے شمار لوگ گاؤں کے آنگن میں استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

لیکن یہ کیا — جوگندر بابو زندہ باد — جوگندر بابو زندہ باد کے نعرے فضا میں گونج

رہے تھے۔

اس گونج سے حیرت زدہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ وہ جیت گئے تھے۔
مشتعل عوام نے اپنا تیار کردہ ہار ایک دوسرے کو پہنانا شروع کر دیا۔

دراصل اس بار جوگیندر بابو نے گاؤں کی فلاح و بہبود کی رقم کا کافی حصہ کچھ مخصوص لوگوں کے بیچ بانٹ دیا تھا۔

گاؤں والوں کو مجبوراً اپنی شکست کو گلے لگانا ہی پڑا۔ آخر جیت کے غم کا اظہار آسان بھی تو نہ تھا۔

■■

خواب دیرینہ

گرد آلود چہروں اور میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے بے شمار لوگوں کے من میں نہ جانے توقعات اور تمناؤں کی کتنی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ برہوڑ، چیڑو، بہاریوں، سنتالی، منڈا، اوراؤں، کھڑیا، اسور سبھی کے چہروں پر نئی امنگوں کی ترنگ پھوٹ رہی تھی۔ خوشی بھی کیوں نہ ہو۔ اپنے وجود کی بقاء کی جس تحریک کے تحت وہ گذشتہ چھ دہائیوں سے کوشاں تھے۔ اس کا خوشگوار نتیجہ نکلنے میں چند ہی لمحے باقی تھے۔

آنکھوں کے سامنے پھیلا خوشحالی کے سامراجیہ۔ جس کو پا کر ہر شخص اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے دیرینہ خواب جلد ہی حقیقت کی شکل لینے والے تھے۔ اسی طرح نئے نئے خیالات کا ایک لامتناہی کارواں وادیٔ ذہن وفکر میں رواں دواں تھا۔

خوشیوں کا ایک آباد چمن اپنا ہوگا۔ صرف اپنا۔ کل تک جس چمن کے ایک پھول پر بھی اپنا اختیار نہ تھا، اب تقسیم کے بعد اس کے ایک حصہ پر صرف اپنا اختیار ہوگا۔ اس کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا اپنی زندگی کے لیے سامان مسرت فراہم کرے گا۔

اپنی الگ دنیا ہوگی — اپنا الگ سنسار ہوگا — اپنی الگ زندگی ہوگی۔

ایک طرف جہاں تقسیم چمن سے خوشیوں کی لہر دوڑ رہی تھی، دوسری طرف اس پار کے لوگوں کے لیے آج کی شام اداس بھری تھی۔ ان کی آنکھیں تقسیم سے پیدا ہونے والے اندیشوں کے سبب نم تھیں۔ ہر طرف ماحول میں ایک عجیب قسم کا سکوت طاری تھا۔

ایک طرف آزادی کا جشن تو دوسری طرف جدائی کا غم۔

شام کے بعد رات اور رات کے بعد سیاہی مائل وہ تاریخی صبح۔

لیکن اس بار سانجھ کی لالی میں اداسی تھی۔ دھرتی پر پھیلی شوخی اور چنچلتا میلی لگ رہی تھی۔

زیادہ تر لوگوں میں اپنوں کے بیچ پہنچنے کی خوشی تھی، تو کچھ لوگوں کو اپنے سے چھوٹنے کا گہرا دکھ تھا۔

کچھ لمحہ بعد یہ اداسی سے بھری شام الگاؤ کی ایک چوٹ سے درک اٹھی۔ اس کی چیخ کسی کے کانوں کو بری نہ لگے۔ اس کے لیے بے تحاشہ گاجے باجے ڈھول منجیرے کا انتظام کیا گیا تھا۔

وہ ایک عجیب صبح تھی۔

ہاکرنے آواز لگائی۔ ’حجور! آپ بھی لکھ کر دیئے تھے جھارکھنڈ جانے کو؟‘

’’نہیں......‘‘ نیند میں آنکھوں کو ملتے ہوئے چھوٹکی نے کہا۔

’’چلیئے، ٹھیک ہے، ایک گاہک بچا۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے سائیکل دوڑا دی۔

رکشہ والا جو پڑوس کے بچوں کو اسکول پہنچا تا تھا۔ اس نے آواز دی۔

’’دیدی! آپو......جیئتن کا؟‘‘

’’نہیں رے! سب چلے جائیے گا تو کون ایہاں رہے گا۔‘‘ اپرنا دی نے جواب دیا۔

’’دیدی ہم نہ جائیتے ہئی۔ آپ دوسر رکسہ طے کرلیں۔ اب ایہاں کا رکھا ہے۔‘‘

اتنی دیر میں سبزی والے کا ٹھیلہ کھڑکی کے پاس آ کر لگ گیا اس نے کہا۔

’’آج بڑی اداسی بجھا تا ہے، آج واستو میں ہمارا گھر بٹ گیا، کہیں آپو لوگ نہیں جا رہے ہیں۔‘‘

’’نہیں ہم لوگ رہیں گے۔‘‘ بابو نے جواب دیا۔ سبزی والے نے اطمینان کی سانس لی اور پھر سبزیاں تولنے لگا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد من ہی من بدبدایا۔

’’کچھو نہیں بکاس ہوگا، چن بن کر پہلے مل بھی جاتا تھا۔ اب اوہو پر بڑکا لوگ کا پہرہ لگ جائے گا۔ بکاس ہوگا کہ گریب لوگ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اوہو چھن جائے گا۔ بکاس کربو

کرے گا تو اپنی جھولی میں بھرے گا، کہ جائے گا گریب کو دینے۔ سب کو امیر بنا دے گا تو موٹا جھوٹا کام کون کرے گا۔ اور و ناس کر دے گا راج کا۔"

میں دروازے پر نکلی۔ دیکھا دھنیا مونگری کا کنبہ، جو تقریباً اٹھارہ برسوں سے اسی سڑک کے کنارے جھونپڑی بنا کر رہ رہا ہے۔ اس نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا، روزی روٹی کی امید میں۔ اس نے ٹوکری بُن کر، چولھے بیچ کر بیٹے کو انٹر تک پڑھایا تھا۔ اب جو میں نے اسے بلا کر حال چال پوچھا تو کہنے لگی۔

"میڈم! اب ہم لوگوں کا راج بن گیا ہے۔ ہم لوگوں کو حک ملے گا۔ ہم لوگوں کا روجگار بھی چلے گا۔ اور بیٹوا کو نوکری بھی ہو جائے گی۔ سو اب ہم لوگ بھی اونہیں جاتے ہیں۔ اب یہاں پٹنہ میں بڑی گریبی ہو جائے گا۔"

میں نے دل میں سوچا یہ عورت کتنی خوش ہے کہ اب وہ خوشحال شہر کی جانب کوچ کر جائے گی۔ جہاں بہت کشش ہے۔

دن، مہینے، سال بیت گئے سیاست کی بازی گری چلتی رہی۔

ایک بار میرے پیارے دوست کے بار بار گزارش کرنے پر میں نے آزاد جھارکھنڈ جانے کا ارادہ کیا۔

وہاں پر کچھ جانے انجانے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی ناگفتہ بہ حالت اور دکھ درد بھری زندگی کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوتغذیہ اور بدنظمی کے شکار لوگ اپنی سابقہ زندگی سے ابھر نہیں پائے تھے۔ جنسی طور پر استحصال زدہ لڑکیاں آج بھی بدحالی کا رونا روتی ہیں۔ اطفال مزدور اینیمیا، ٹی بی، ٹٹنس جیسے امراض سے متاثر کسی مسیحا کے انتظار میں آنکھیں بچھائیں ہیں۔ لوگ بیڑی صنعت، ماچس صنعت، اسٹیل کارخانے اور آتش بازی کی صنعت کے علاوہ پلیٹ دھونے، جوتے پالش کرنے، سر پر بوجھ ڈھونے، موٹر صاف کرنے، فٹ پاتھ پر سامان بیچنے اور خلاصی کا کام کرنے میں پورے خلوص اور تندہی سے لگے ہیں۔

کئی دنوں تک سیر و تفریح ہوتی رہی۔ اسی دوران مجھے دھنیا مونگری کا کنبہ بھی اتفاق سے مل گیا۔ میں بہت خوش ہوئی۔ ان کے بچوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور خوش ہوئے۔

ان کے بچے مجھے جھونپڑی نما مکان میں لے گئے۔ ویسی ہی جھونپڑی جس میں رہنے کے وہ عادی تھے۔

میں تو صرف اس لڑکے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کہ جسے دھنیا موگری نے بڑے شوق اور امید سے انٹرمیڈیٹ تک پڑھایا تھا۔

پتہ چلا وہ سائیکل کا پنچر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دو لڑکے مظفر پور میں قالین کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔

میں نے ان سے گھر کے حالات کے بارے میں مزید پوچھا تو بچوں کی ماں نے گد گد آواز میں کہا۔

''اونہاں سے او سب کما کے لائے گا تبے ہمارا دن پھرے گا۔''

میں نے دیکھا۔ موگیری کو آج بھی اپنی خوشگوار زندگی کا انتظار ہے۔

■■

رشتوں کی کڑواہٹ

پلکوں پر جھلملاتے آنسوؤں کی قطار رہ رہ کر اس کے سامنے بیٹھے شخص کی تصویر کو دھندلا کر دیتی ہے۔ اسی طرح، جس طرح کہ یادیں دھندلی ہو گئی تھیں۔ اس پر حالات کی گرد جم گئی تھی۔ یہ گرد صاف ہونے کے بجائے اس پر اداسیوں اور ناکامیوں کی تہیں جمتی چلی جا رہی تھیں۔

اس کا دل کہتا — یہ اجنبی جو کچھ پوچھ رہا ہے اسے سچ سچ بتا دو۔ لیکن غریب آتما کہتی، مت بتاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اس دنیا میں کوئی کسی کی باتیں سن کر اس کی مدد نہیں کرتا۔ صرف مذاق اڑاتا ہے۔ اس لیے چپ رہو، خاموشی سے جیسے اتنے دنوں سے لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتی آئی ہو۔ اسی طرح اسے بھی دے دو۔

لیکن یہ شخص بضد تھا۔

وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا، اس عورت کو، جو عمر میں یہی کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ شکل وصورت کوئی خاص نہیں۔ لیکن ہاؤ بھاؤ پرکشش تھے۔ اس کے پاس ایک بچہ بھی تھا۔ وہ شخص اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ لڑکی شادی شدہ ہے۔ شادی کے بعد وہ سسرال سے نکال دی گئی۔

سسرال سے نکالی گئی لڑکی کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ گھر کی ہوتی ہے نہ گھاٹ کی۔ اس کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا ہے۔ اب اس کے پاس ایک بچہ بھی ہے۔ یہ بچہ اس کے شوہر کا ہے یا راستے کے کسی خواہشمند کا ثبوت، پتہ نہیں۔

یہ شخص جاننا چاہتا تھا کہ لڑکی سڑک پر کس طرح آ گئی۔ گرمی کی چلچلاتی دھوپ اور برسات کی تیز دھار اس کے اوپر سے پار ہو گئی۔ وہ لوگ جو انصاف پسند کہلاتے ہیں۔ اسے

دیکھتے رہے۔ کسی نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔

پانی برسنے پر وہ پاس کے کسی برآمدے یا چھاؤں دار درخت کے نیچے پناہ لیتی۔ جب تک وہ خود اٹھتی، بچہ کو اٹھاتی، بستر اٹھاتی، تب تک وہ پوری طرح بھیگ چکی ہوتی ہے۔ پھر اسی گیلے میں پڑی رہتی۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا بنا رہتا۔ اس کی حالت جاننے کے لیے کسی بھی حساس شخص کا دل بے چین ہو اٹھتا۔

اس کے من مندر کا دیپ بجھ گیا۔ لیکن باہر مندر میں دیپ جلانا وہ نہیں بھولتی۔ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ کر بھی ایشور پر بھروسہ تھا کہ وہ اسے اس کی حالت سے ضرور نجات دلائے گا۔

یہ عورت اَن پڑھ تھی۔ مگر زندگی کی کٹھنائیوں سے حاصل شدہ تجربے کا اسے بے پناہ علم تھا۔

اس شخص کی پرخلوص نگاہوں سے ٹکرا کر اس کی یادیں ٹوٹ کر بکھر جانے کو بیتاب ہو اٹھیں۔ پھر بھی وہ آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ ان یادوں کو چھوڑ کر۔

مگر اس وقت اس کا دل پیچھے چھوٹا جاتا تھا۔ لہٰذا اپنے دل سے مجبور ہو وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ گئی۔

آج کئی دنوں سے میں بخار میں تپ رہی ہوں، کوئی پرسان حال نہیں۔ انسانی رشتوں پر مجھے بھروسہ نہیں۔ شاید اس لیے اپنے دکھ میں کسی کو شریک نہیں کرتی۔ مجھے اپنے بنائے ہوئے خونی رشتے کی تلاش رہتی ہے۔ اس مقام پر آ کر مجھے رشتوں کی کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میرا رشتہ ہی نہیں ہوا ہوتا۔ ہر لمحہ ان رشتوں نے دکھ ہی تو دیا ہے۔ رشتہ انسان خود ہی بناتا ہے۔ پھر اس میں جال بنتے جاتے ہیں اور وہ اس جال میں خود پھنستا چلا جاتا ہے۔ کیا رشتہ بنانا اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک بوجھ بن جائے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اس اجنبی نے اسے چپ رہنے کو کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اسے اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی کہ ابھی میری باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ جب دل کے ساز کو چھیڑا ہے تو اس کی آواز بھی سن کر جاؤ۔ جب تک وہ اٹھتی۔ وہ شخص جا چکا تھا۔

اسے پھر سے غصہ آنے لگا۔ کیوں کوئی جھوٹی ہمدردی دکھاتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

پھر سوچنے لگی، میری زندگی سمندر میں تڑپتی اس مچھلی کی طرح ہے جو پانی کے تھپیڑوں اور اس کے دباؤ کو جھیل کر ہوا کا ایک بلبلا لینے اوپر آتی ہے۔

ہوا میں سانس لینے اور زندہ رہنے کی چاہ اس کے جسم کو توڑ مروڑ کر اوپر آنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر میں زندہ رہنے کی چاہ کو ختم کر دوں تو زندگی ختم نہیں ہوگی بلکہ میرے پیچھے میرے معصوم بچے کی ہر روز موت ہوگی۔ میں اسے ہر روز مرنے نہیں دینا چاہتی ہوں۔ ہر تھپیڑے اور ہر دباؤ کو جھیل کر بھی۔

وہ اپنے خیالوں کے جال بُن رہی تھی کہ وہ اجنبی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ قریب آکر اس نے دوا دی اور کہا— ''کھالو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

وہ انکار نہ کرسکی دوا لے کر رکھ لی۔

اسی طرح تین چار دن ہو گئے۔ وہ شخص نظر نہ آیا۔ وہ عورت اسی طرح سڑک پر دن رات گزار رہی تھی۔

شادی شدہ عورت ایک ایسا پودا ہے جس میں ایک پھول کھلنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر اس پودے کو پھول نہ ملتا تو یہ ہمیشہ کے لیے مرجھا جاتا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی پودا تھی۔ جس میں ایک پھول تو کھلا لیکن پھر بھی وہ مرجھا گئی تھی کہ پودے میں پانی ڈالنے والا مالی ہی کھو گیا تھا۔ مالی کی تلاش میں اس کے پیار کا پرشاد لیے وہ کٹیلے راستے پر اکیلے چل رہی تھی۔ اپنے مالی کو وہ بتا بھی نہ سکی کہ اس کہ پیٹ میں اس کے پیار کا پرشاد پل رہا ہے یا کہ اس نے ضروری ہی نہ سمجھا۔

جب اس گھر سے جانا ہی ہے تو بچے کا موہ دے کر کیوں انہیں رجھایا جائے۔ کیا پتہ بچہ ہونے تک پاس رکھے پھر بھگا دے۔ اس نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ان سب کی خواہش کے مطابق اس گھر کو الوداع کہہ دیا۔

وہ اس اجنبی کو بتا رہی تھی کہ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک بیوہ ماں کی بیٹی تھی اور اکلوتے نشہ خور بھائی کی بہن۔ جس نے اس کی شادی سے ایک دن پہلے ماں کے ذریعہ اکٹھا کئے

زیورات چرا کر بیچ دئے۔ ماں کو خبر ہوئی تو وہ بدحواس ہوگئی۔ اتنی جلدی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا تھا اور نہ بارات ہی واپس جا سکتی تھی۔

لہٰذا محلے کی عورتوں نے رائے دی کہ ویسے ہی لڑکی کو بھیج دو۔ جو ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا۔

میری ماں نے ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد جو ہوا اس کو دیکھنے کوئی نہیں آیا۔ صرف میری ماں اس ابتر پریوار کی حالت دیکھنے کبھی کبھار آتی رہی۔

مجھ پر اور خود پر رحم کرنے کی منت سماجت کرتی رہی۔

آخر میرا غم اس کے سینے پر بوجھ بن گیا وہ میرے غم کے بوجھ کو لیے اس دنیا سے چلی گئی۔ اور میرے غم دو بالا ہو گئے۔

آج جس جگہ پر میں پہنچ گئی ہوں اس کے پیچھے یہی سارے وجوہات ہیں۔

وہ اجنبی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور یہ سوچتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا کہ کیا ہوگا ان ماں بیٹے کا مستقبل۔ اس کی پرورش اس کی پڑھائی لکھائی اس طرح سڑک پر ہوگی یا کوئی تدبیر نکلے گی۔

پھر وہ اپنی ہتھیلی، پھیلا کر ان کی لکیریں دیکھنے لگا۔

■■

نظر بند

جاتی امراء کا وسیع و عریض علاقہ اور اس میں واقع پرشکوہ محل کے ایک ایک حصہ سے غم واندوہ کا غبار اٹھ رہا ہے۔ کیونکہ آج اس کے محافظ کے آسمان زندگی پر آلام ومصائب کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

روبی لان میں اداس بیٹھی ہے۔ اس کے گھر کے گوشے گوشے میں مادی راحت و آسائش اس کا منہ چڑھا رہی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا - اسی راحت و آسائش کے تو وہ بھگت بھوگی ہوئے ہیں۔

یہ دن بڑی بے چینی میں گذارے ہیں۔ لان سے اٹھ کر وہ کمرے میں آگئی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے وہ ایک نظر کمرے پر دوڑاتی ہے۔ یہ عالیشان کمرہ، جس پر غیر ملکی قالین۔ اس پر قیمتی صوفہ، نقاشی دار دیوار، قیمتی بک سلف...... جس پر ملک و بیرون ملک کے معروف رسالے و جریدے رکھے ہوئے ہیں۔ پرشکوہ آرائش و زیبائش۔ باہر اس کے ایک اشارے پر گاڑی تیار۔ ہر کونے پر حفاظت کا سخت بندوبست۔

روبی کو برسوں قبل کا وہ تین کمرے کا فلیٹ یاد آگیا۔ جہاں شام چھ بجتے بجتے ابا جان، ممی بھیا سب کے سب اکٹھے ہو جاتے تھے۔ دادا جان کی سرپرستی میں ناشتہ کھانا اور نصیحتیں ملتی تھیں کسی کی آمد کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ لیکن اب — اب تو محض وہ ایام خواب وخیال کی باتیں بن کر رہ گئے ہیں۔

دادی کہتی ہیں۔

”جب سے اسے سیاست کی بیماری لگی ہے۔ نام ونمود کا چسکا لگا ہے، وہ ہم سے دور ہو

گیا ہے۔"

"ہاں دادی جان! ابا حضور ہم سے دور ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب کچھ تمہارے لیے ہی تو ہے۔"

ابا جان کے بارے میں باتیں سن کر حارث بھی دادی جان کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ اور نصیحت کے انداز میں بولے۔

"ان لوگوں کے بارے میں سوچو روبی جو اس بات سے دہشت زدہ ہیں کہ اعلیٰ عہدے داروں کے جھگڑے میں ہم بے بسوں کی نہ جانے کتنی جانیں قربان کرنی پڑیں گی۔"

"ہاں بیٹا۔ دادی جان نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔" ہمیں تو عوام کے بارے میں ہی سوچنا چاہئے۔"

پر امن انقلاب کے بعد روز کمانے کھانے والے گھروں کی عورتیں موت کے خوف سے اپنے مرد کو باہر جانے سے روک رہی ہیں، لیکن وہ بھوکوں مرنے کے ڈر سے ایک ساتھ دو موتوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔

گلی محلے اور سڑکوں پر فوجیوں کی گشت سے سارا علاقہ دہشت زدہ ہے۔ خون خرابے کے بعد چھائے ہوئے سناٹے کا ماحول، آنکھوں کے سامنے خون آلودہ انسانی جسم، دکان لٹنے کا اندیشہ، بھوکوں مرنے کا خوف...... ایسے خوفناک ماحول میں زندگی بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔

"لیکن بھائی جان! ہمارے ابا جان ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ اپنے اہل وعیال کو وقت نہ دے کر ملک اور ملک کی عزت کے لیے جیتے ہیں۔ کئی کئی دنوں تک تو انہیں سونے کا بھی موقع نہیں مل پاتا ہے۔ انہیں کو ایذا پہنچائی جارہی ہے۔ مجھے یہ سب برداشت نہیں ہو پاتا میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

کہنے کے ساتھ ہی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

حارث نے بات کا رخ بدلا۔

"میں نے ملک و بیرون ملک کے ارباب سیاست سے ان کی سلامتی کے لیے اقدام اٹھانے کی گزارش کی ہے، جلدی ہی ہمارا ان سے براہ راست رابطہ ہوگا۔"

یقین کے اس جھونکے نے اس کے دل کو وقتی راحت عطا کی۔

روبی کی دوست رومانہ کے آجانے سے حارث اور دادی ماں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں ممی کو خاموش دیکھ کر حارث نے کہا۔

''بڑے لوگوں کی زندگی میں بڑے بڑے واقعات ہوتے ہیں۔ ہمیں اتنا کمزور نہیں ہونا چاہئے۔ مصیبتوں کو جھیلنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ ہم اپنی مصیبت سے دکھی ہیں۔ کیا صرف ہم ہی دکھی ہیں؟ نہیں پورا سماج دکھی ہے۔''

ماں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر درمیان میں دادی ماں بول پڑیں۔

''ہمارے ملک کا قانون بڑا عجیب ہے۔ کہیں اسے سزائے موت نہ ہو جائے۔''

''نہیں دادی جان ایسا نہیں ہوگا۔''

حارث نے دیکھا ماں کے صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ 'ممی' حارث نے انہیں مخاطب کیا۔

''ہاں بیٹا! ۱۲ر اکتوبر سے تختہ پلٹ کے بعد گرفتاری اور نظر بندی کا جو سلسلہ چلا تو ہم ان کی آواز تک کو ترس گئے ہیں۔ خدا جانے وہ زندہ بھی ہیں یا......''

''ہاں بہو، اس نے بھی تو اپنی خودداری اور ملک کے وقار کو بڑھانے کے لیے بے شمار لوگوں کی جان لینے جیسی مذموم کوشش کی ہے۔ راجا کو نرم دل اور معاف کرنے والا ہونا چاہئے۔ یہ راجا کی بہت بڑی صفت ہوتی ہے۔''

حارث نے بھی والد کی غلطی کو مان کر اپنے دل کو سمجھایا کہ انہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ہم سب لوگ ان کی وجہ سے پریشان ہیں۔

ایک حکمراں کی بیوی کی آنکھیں شوہر کے دیدار کو بیقرار تو تھیں لیکن انہوں نے ضبط وتحمل سے کام لیتے ہوئے بیقراری ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ جانتی تھیں۔ ان کے شوہر خود کو سب سے طاقتور ماننے لگے تھے۔ سوغاتوں سے ان کا گھر بھر گیا تھا۔ وہ بارہا احتیاط برتتے ہوئے کہتیں۔

''ہمیں یہ سب نہیں چاہئے۔ہم عوام کے نمائندہ ہیں۔جب وہ ہی آرام سے نہیں ہیں تو ہمارے آرام آرائش اور اس جھوٹی شان وشوکت پر لعنت ہے۔''

شوہر ان کی باتوں کو سننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔اب ماں سے بچوں کی بے چینی دیکھی نہیں جاتی۔خصوصاً بیٹی جو ہر وقت ابا کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔اب ابا کے بغیر انتہائی متفکر اور اداس رہتی ہے۔

ماں کا چہرہ آنسوؤں کی بارش سے شرابور ہو گیا۔جب انہوں نے اپنی بیٹی کی دوست رومانہ سے کہتے سنا۔

''جانے کس تنہا اندھیری کوٹھری میں ہمارے ابا کو چھپا رکھا ہے۔جس عوام کے لیے وہ دن رات بے چین رہتے تھے۔اس عوام نے ان کی گرفتاری اور نظر بندی پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔''

''نہیں روبی! دراصل وہ عوام کو بھول چکے تھے۔ان کے مسائل سے انہوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ان کی حکومت میں عوام صرف جھوٹی یقین دہانی پر جی رہے تھے۔سکھ دکھ کی اسی کشمکش نے ان سے انہیں دور کر دیا۔''

باتوں سے من کا خالی پن بھرنے والا نہیں تھا۔اس لیے وہ بالآخر چپ ہو گئی۔

دن گذرتے جا رہے ہیں۔ہمارے سارے متعلقین، رشتہ دار خاموش ہیں۔

چچا جان بھی ادھر کئی دنوں سے نہیں آئے تو حارث نے سوچا کہ تنہائی کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے چچا جان کی کوٹھی پر چلا جائے۔

چچا جان ڈائننگ ٹیبل پر رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔مختلف زیبائش سامانوں سے آراستہ ٹیبل کو دیکھ کر یہ بات واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی کہ اس گھر میں ابا کی گرفتاری سے کسی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ان کے دل میں مختلف خیالات ابھرنے لگے۔یہ محل، اس کی شان وشوکت اور زندگی کی ساری سہولیات ابا نے ہی تو فراہم کرائی ہیں۔

ادھر چچا جان بے توجہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے میں مشغول ہو گئے۔انہوں نے اخلاقاً بھی انہیں کھانے میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ان کے ضمیر اور غیرت کو زبردست ٹھیس

لگی۔تاہم وہ اسے برداشت کر گئے۔

''چچا جان! ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔''

یہ جملہ سنتے ہی چچا جان کے کھانے میں جیسے کنکر آ گیا ہو۔اچانک انہوں نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہیں؟اس نے ساری عزت مٹی میں ملا دی۔کئی نسلوں کا مستقبل سنوارنے میں لگ گیا تھا۔اپنے عہدے کے وقار اور فرائض کو فراموش کر گیا تھا۔''

پھر ایک لمحہ کو رکے۔حارث کا چہرہ پڑھا پھر بولنا شروع کیا۔

''نظر بندی کی یہ سزا اسے بطور انعام ملی ہے۔''

ادھر حارث درمیان میں ہی اٹھ کر چلے گئے۔راستے بھر اپنے پرایوں کے متعلق عجیب وغریب خیالات ان کے دماغ میں گردش کرتے رہے۔کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔عوام کی عدالت میں چل کر اور اس کے سامنے گڑگڑا کر ہی کچھ ہو سکتا ہے۔عوام الناس ہی ہمیں ہمارے ابا جان سے ملوا سکتے ہیں۔

اب وہ تن من دھن سے عوام کی خدمت اور اس کا اعتماد حاصل کرنے کا ارادہ کر کے لمحاتی راحت محسوس کر رہے تھے۔

ہفتوں بعد شب کے سناٹے کو چیرتی ہوئی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

یہ آواز کسی اور کی نہیں تھی۔

یہ آواز ان کے ابا جان کی تھی۔

ان پریشانیوں میں مسرت کی ایک لکیر ان کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

■■

چھاؤں کی دھوپ

ایک نوجوان لڑکے کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں۔ وہ محنتی اور ذمہ دار بھی تھا۔ اپنے کام اور ذمہ داریوں کے تئیں کبھی لاپرواہ نہیں ہوا۔

مگر ادھر کچھ دنوں سے وہ چپ چاپ سا رہتا ہے۔ اندر ہی اندر کسی بات پر کڑھتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ اس عمر میں اتنی خاموشی اچھی نہیں۔ پہلے اس کے دوست احباب ملنے آتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ مگر اب کوئی نہیں آتا۔ ماں سوچتی۔۔۔ کہیں کسی سے جھگڑا تو نہیں کیا ہے؟ نہیں، جھگڑا تو پہلے بھی دوستوں سے کیا کرتا تھا۔ مگر چہرے پر ایسی خاموشی کبھی نہیں چھائی تھی۔ اتنا پریشان وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

ماں فکرمند ہوگئی۔ اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ دوسرے پل ماں نے سوچا۔ اس نازک عمر میں کہیں کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا تو نہیں ہوگیا۔ مگر لڑکی کے نام سے وہ شرماتا ہے۔ رامو کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں۔ ساری کمائی تو مجھے ہی لاکر دے دیتا ہے۔

وہ کئی دنوں سے اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک دن رامو نے بتایا۔

''اماں! میرے دوستوں نے کہا ہے کہ تو اچھے گھر کا لڑکا نہیں ہے۔ تو میری منڈلی میں نہیں رہ سکتا ہے۔ شرابی باپ کا بیٹا ہے تو۔''

اس کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

''اب میں ان لوگوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ وہ بھی میری طرف نہیں آئیں گے۔''

''اماں! میں تو شراب نہیں پیتا...... مگر اب پیوں گا۔ روز پی کر آؤں گا۔ باپو کی طرح۔''

اب وہ سارا سارا دن غائب رہنے لگا۔ اور شام کو ہمیشہ دیر سے آتا۔ مگر بغیر پیے

ہوئے۔

ماں نے محسوس کیا— وہ دن بہ دن دبلا اور کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے پوچھا—

''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' کہہ کر وہ کتابوں میں ڈوب جاتا۔ کتابیں اس کی تنہا دوست بن گئی تھیں۔

ماں بیٹے اب ایک ساتھ کم ہی بیٹھتے تھے۔ بات چیت بھی اب کم ہی ہوتی تھی۔ صبح چائے پی کر وہ چلا جاتا۔ دوپہر کو کھانے پر آتا پھر شام کو رات گئے آتا۔ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں قید ہو جاتا۔

شروع سے ہی شوہر سے وہ ڈرتی تھی اب بیٹے سے بھی ڈرنے لگی۔ ساری زندگی ڈر میں ہی بیتی۔ ڈر اس کی روح میں سمایا ہوا تھا۔ ہر آہٹ اسے خوفزدہ کر دیتی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھی کہ بیٹا شراب پی کر نہیں آتا۔

ایک رات جب رامو سو گیا تو ماں اس کے کمرے میں گئی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کانپ گئی۔ اس کے چہرے سے محبت اور نفرت کی ملی جلی لکیریں صاف عیاں تھیں۔ اسے دیکھتی رہی ایک ٹک۔ آہٹ کا احساس ہوتے ہی رامو نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے اور قریب بیٹھ گئی۔ وہ ماں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ماں کو گھٹن ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دکھ کے بوجھ سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔

''روؤ مت اماں! ذرا سوچو ہم لوگوں کی زندگی کیسی ہے۔ تم پینتیس برس کی ہو گئی کون سی خوشی دیکھی ہے تم نے۔ باپو ہمیشہ تم کو مارتے ہیں۔ وہ اپنے تمام دکھ درد اور کڑواہٹوں کا بدلہ تم سے لیتے ہیں۔ تمہاری پیٹھ پر پڑے چوٹ کے نشان وہ کیوں نہیں دیکھتے۔ تمہاری آنکھوں کے آنسو، تمہارے قدموں کی لڑکھڑاہٹ۔ کیسی ہو اماں! جو خاموشی سے دکھ سہہ لیتی ہو۔ مار بھی کھا لیتی ہو، ڈانٹ بھی سہہ لیتی ہو۔ پھر اسے کھانا بھی پکا کر دیتی ہو۔ اس کے کپڑے بھی دھوتی ہو، دیر سے آنے پر پریشان بھی ہوتی ہو۔ محلے کی سبھی عورتیں تو ویسی ہی ہیں۔ سونا کی اماں بھی تمہارے جیسی ہے۔ کل اس کے پتی نے بھی اسے مارا تھا۔ ماتھا پھوٹ گیا تھا۔ اس کی بیٹی نے

دوا لگائی۔ گھر کے سارے بچے رو پیٹ رہے تھے۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ لیکن کسی نے بچایا نہیں۔ بلکہ سونا کی اماں کو ہی بولنے لگے کہ زبان چلاتی ہے اسی لیے مار کھاتی ہے۔ کسی نے نہیں کہا کہ وہ نشہ کرتا ہے۔ اسے نشے میں، مارتا ہے۔ اسے یہ نہیں سوجھتا کہ چوٹ کہاں لگے گی۔''

'رامو کا باپو بھی اپنی عورت کو مارتا۔ گالیاں دیتا۔ وہ کچھ نہیں بولتی۔ کیسے یہ سب برداشت ہوتا ہے۔ غم کیسے سہہ لیتی ہو، کیسے رہ لیتی ہو۔ اس گھر میں۔ کیوں نہیں چھوڑ دیتی انہیں۔ کیوں نہیں چلی جاتی اپنے بابا کے گھر۔ سارا دن کام کرتی ہو اور پھر شام کو مار کھانے کے لیے بیٹھی رہتی ہو۔ وہاں بھی کام کر لیتی۔ دو جون کی روٹی جٹا لیتی۔ باپو تمہیں پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں دیتا پھر کس کے موہ میں پڑی ہو یہاں؟ بولو اماں!'' ماں نے اقرار میں سر ہلایا۔

اسے ایک انوکھا احساس ہو رہا تھا جس میں خوشی بھی تھی اور غم بھی۔ اس کی باتوں نے زندگی کی مردہ کڑواہٹوں میں جان ڈال دی تھی۔ اس کا بیٹا جواب سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے الفاظ سے اس کے چہرے سے جو کچھ بھی ظاہر ہو رہا تھا وہ ماں کے دل کو چھو رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اس کو اچھی طرح سمجھنے لگا ہے۔ اس نے دکھ درد کا ذکر کر دیا ہے۔ اس کی اماں سمجھ رہی تھی بیٹا جو کچھ کہہ رہا ہے، ہم عورتوں کے بارے میں، وہ ایک کڑوا سچ ہے۔ جسے ہم ہی جانتے ہیں۔ اس کے جذبات نے ماں کو سرشار کر دیا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ مگر آنکھوں میں امید کی خوشی ہونٹوں پر مسکان تیر گئی۔

ماں جانتی تھی بچپن سے ہی وہ باپو سے ڈرتا تھا۔ جیوں جیوں بڑا ہوتا گیا، سب سے ڈرنے لگا۔

لوگوں کے لیے اس کے دل میں نفرت بڑھنے لگی۔ ان لوگوں کے لیے جو شراب پی کر عورتوں پر ظلم کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسے لوگوں پر اسے ترس آتا ہے۔ وہ کہتا۔

''اماں! وہ لوگ اپنی حیوانیت کے لیے خود ذمہ دار نہیں ہوتے۔ حالات انہیں شراب

پینے، جوا کھیلنے، چوری کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ غریب ہوتے ہیں۔ ان کے پاس روزگار نہیں ہوتا۔"

تب اس کا دل ہلکا ہو جاتا۔ من میں گھلی کڑواہٹ کم ہو جاتی۔

آج ماں خوش تھی۔ پہلی بار زندگی میں کسی نے سمجھا تھا۔ اس کے دکھوں کو محسوس کیا تھا۔ اس کی زندگی کامیاب ہو گئی۔ بیٹا اسے سمجھنے لگا۔ سوچتی ہوئی اٹھی۔

ابھی وہ برآمدے تک پہنچی ہی تھی کہ کسی جانے پہچانے قدموں کی آہٹ سے وہ کانپ گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا پتی سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ نشے میں تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا بڑھتا ہی گیا۔ بڑی بے رحمی سے اسے دبوچ لیا۔ اتنی سختی سے کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ دم پھولنے لگا اس کے چنگل سے چھوٹنے کو وہ شدت سے تڑپنے لگی۔ جب نشہ ہلکا ہوا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہ گہری آہ بھر کر رہ گئی۔

زندگی اسی طرح گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ کبھی رو کر، کبھی مسکرا کر اور کبھی خاموشی سے اور سسکتے ہوئے۔

یہ عورت خوش تھی کہ وہ اب بیٹے کی چھاؤں میں ہے تو کبھی کھلکھلا کر ہنسنے کا بھی وقت آئے گا۔

ایک صبح رامو نے دیکھا۔ ناشتے کے لیے اس کا باپو ماں کو ڈانٹ رہا ہے۔ ماں کی طبیعت خراب تھی اس لیے اٹھنے میں دیر ہوئی۔ اس کی ماں بخار سے تپ رہی ہے۔ اس نے کہا— "اماں! لاؤ روٹی ہم بنا دیتے ہیں۔"

اور وہ ماں کے ساتھ مل کر روٹی بنانے لگا۔

جب وہ تھالی لے کر باپو کے پاس گئی تو اس نے تھالی کھینچ کر دے مارا۔

"اتنی دیر میں کیوں لائی۔"

کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیٹا غصہ سے تلملا اٹھا۔ بھنویں تن گئیں۔ باپ کی حیوانیت پر۔

ماں کے چہرے پر عجیب سناٹا چھا گیا۔ شرمندگی سے نگاہ اوپر نہیں اٹھ رہی تھی۔ ماتھے پر

چوٹ کے نشان ابھر آئے۔ ماں نے اپنے گھونگھٹ کھینچ لیے۔ آنکھیں بند کر لیں تا کہ آنسو باہر نہ نکل سکے۔

شام کو رامو گھر لوٹا تو شراب پی کر۔ آج پہلی بار اس نے شراب پی تھی۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ گھر میں گھسا اور کمرے میں آ کر پلنگ پر پڑ گیا۔ ماں پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ نشے میں اس کا جسم نڈھال ہو رہا تھا لیکن حواس قائم تھے۔ وہ تھوڑی دیر پر آنکھیں کھولتا اور بول اٹھتا۔

''کیا میں نشے میں ہوں۔'' ماں کو دیکھ کر وہ جھینپ گیا۔ ماں کا پیار اس کی آنکھوں کو چھو گیا۔ اس نے پلکیں جھکا لیں آنکھوں میں آتے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ ماں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے دھیرے سے کہا— ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''باپو بھی تو پیتے ہیں انہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ سبھی لوگ تو پیتے ہیں۔ لیکن میرا جی برا ہو گیا۔ تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اماں یہیں بیٹھی رہو۔ میری پلکیں بھاری ہو رہی ہیں میرا جی متلا رہا ہے۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ اماں یہیں بیٹھی رہو میں مر جاؤں گا۔''

اس نے ماں کا پلو کس کر پکڑ لیا۔ اس کے آس پاس سب کچھ گھومنے لگا۔

ماں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا سہی آواز میں بولی۔

''اگر تم نے بھی پینا شروع کر دیا تو میرا پیٹ کون پالے گا۔ تم اب مت پینا۔ تمہارے باپو کو کافی جھیل چکی ہوں۔ کیا تم سے بھی وہی ملے گا۔ تم بھی مجھ پر ترس نہیں کھاؤ گے۔''

ماں کا بھروسہ ٹوٹ گیا، اس کے دل کو گہرا دھکا لگا۔ زندگی ایک خاموش چیخ بن گئی۔ جس چھاؤں کے انتظار میں وہ پتی کے چھاؤں کے درد کو جھیل رہی تھی، اسے بھی دھوپ نے آن لیا۔

■■

منتظر آنکھیں

دھان کی ہری بھری کیاریوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئیں دوشیزائیں شام کے وقت گھر کولوٹ رہی تھیں۔ان کے شباب کی کشش اور ہریالی کے خوبصورت نظاروں سے دھرتی ماں کا دل اچھالے لے رہا تھا۔سڑکوں کے کنارے کھڑے گھنے سایہ دار درخت زلف گرہ گیر سے مرصع حسیناؤں کے سروقد دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔

اسکول سے گھر لوٹتے بچوں کا جھنڈ اپنے جوش وخروش بھرے قدموں سے دھرتی ماں کو فخر عطا کر رہا تھا۔

انہیں دیکھ کر دھرتی ماں کے سینے کو ان دو معصوموں کی یادیں چھید کر گئیں۔ سینے میں اٹھنے والی شاندار مستقبل کی کسک خاموش ہوگئی۔ پل بھر کو پودوں کا جھومنا بند ہوگیا۔اس کی فکر سے دھرتی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔وہ ماں بچوں کے لیے چھپٹا رہی ہوگی۔بستر پر پہلو بدل رہی ہوگی۔کھلونوں کو دیکھ کر بچوں کی خواہش مچل رہی ہوگی۔

حقیقت میں یہ دنیا سکھ دکھ کا امتزاج ہے۔کہیں خوشیوں کے گیت تو کہیں غم واندوہ کے لیے آہ وبکا۔

انسانی محبت کا پیغام پھیلانے والوں کی نسل کو ختم کر دینے کی اس نئی روایت سے دھرتی ماں کا من چھٹکارا نہیں پاسکا۔وہ گھوم پھر کر وہیں چلی جاتی جہاں ایک بے بس ماں شوہر اور بچے سے ایک ساتھ محروم ہوگئی تھی۔

یہ قدرت کی دین نہیں تھی کہ ہم اس کی مرضی کے آگے سر خم کر دیں۔یہ تو انسان کے ذریعہ پیدا کردہ غم تھا۔

وہ سبزی چھیل کر رکھ چکی تھی۔ سامنے سے سایہ کی شکل میں اس کا چھوٹا بیٹا نظر آیا۔ وہ لپک کر دوڑی۔

پردے کو ہٹایا۔ کمرہ ویران تھا، دالان سنسان تھا۔ تب یہ افسوس کیسا۔ کسی کے ہونے کا احساس کیسا؟ شوہر اور بچے۔ وہ دیواروں سے ٹکرا گئی۔ دیواروں پر دونوں ہاتھوں سے مارنے لگی۔ جب دیوار کی چوٹ سہہ نہ پائی تو دروازے پر لگے پردے کو ہاتھوں میں پکڑ کر دانتوں سے کاٹنے لگی۔ بالوں کو نوچ کر بے ہوش سی ہو گئی۔ خود کو ایذا دینے کی صلاحیت جب جواب دے گئی تو پھوٹ پڑی۔

ضعیف پھوا سمجھا سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ جب بچے کو دیکھنا چاہتی تو تصویر لا کر سامنے رکھ دیتی۔ تصویر سے اس کا من تھوڑی دیر کے لیے بہلتا تو ضرور تھا۔ مگر دوسرے ہی پل وہ اپنے آس پاس ان بچوں کو چلتا پھرتا دیکھنے کو بے چین ہو جاتی۔ تصویر کو سینے سے لگا کر ہی بستر پر لیٹ پاتی۔

اسے لگتا رات میں اس کا آدمی آ گیا ہے۔ وہ اسے اندھیرے میں پیار کر رہا ہے۔ اسے اپنے لمس سے جگا رہا ہے۔ یہ احساس ہونے پر کہ اب وہ نہیں ہے۔ اس کی چیخ نکل پڑتی۔ کانوں میں سرگوشی ہوتی۔ وہ ہے، وہ ہے۔

محبت کرنے والا شوہر رخصت ہو چکا ہے۔ یہ کیسی رخصتی ہے۔ جو اسے تڑپتا چھوڑ گئی۔ شوہر کا پیار اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا اسے چومتا، پیار کرتا، اور وہ شرم کے مارے نہ کچھ بول پاتی، نہ اسے روک پاتی۔

کانوں میں سرگوشی، گلے میں اٹکی سسکی، من کے اندر گہری ٹیس۔

غم واندوہ سے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اب کسی بات پر ہنستی نہیں۔ جب سب کچھ تھا تو میکے کی یاد بھی سہانی لگتی تھی۔ اب کسی کی یاد نہیں آتی۔ اس غم کا کوئی دوست نہیں۔ انسانیت مٹ گئی، زندگی خوفناک ہو گئی۔ انسانی محبت کی تعلیم اب نفرت میں بدل گئی۔

اجنبی آنکھوں کے آنسو پوچھنے والی آنکھیں اپنے ہی گھر میں زندگی بھر کا آنسو دے گئیں۔ سسکتی ہوئی ماں کو بچپنے میں کی گئی بیٹے کی نصیحت کا شدید احساس ہوا۔

ماں ! میں ہوں— تمہارے پاس، تمہارے ساتھ، اپنے آنسو بھول جاؤ۔اس محبت کی ریاضت کومت ترک کرو۔تم نے ایشور کی راہ میں اپنی سب سے قیمتی چیز خیرات کی ہے۔اس کا غم نہیں منایا کرتے۔

اس انمول خیرات کا احساس ہوتے ہی بچے اور شوہر کی دیدار میں امید لگائے ویران آنکھیں چمک اٹھیں۔من مندر میں اٹھتا ہوا جوار بھاٹا خاموش ہوتا ہوا محسوس ہوا۔پھوا کے ساتھ وہ نیتو کے گھر گئی۔آج نیتو کا شگون آیا ہے۔

عورتوں، بچوں کی بھیڑ میں خود کو کسی حد تک ہشاش بشاش محسوس کیا۔ پھر بھی خود کو غیرت مند ظاہر کرنے کی اداکاری نہیں کرسکتی تھی۔من کو سخت کرنے کی کوشش میں پلکوں کی پوریں بھیگ جاتیں۔

الیسٹر نے نیتو کے ماتھے کا بوسہ لیا تو نیتو اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں پائی۔نیتو کو ہمیشہ سے ہی اس ماں کے اندر اپنی ماں بیٹھی ہوئی نظر آئی۔جب کبھی وہ اپنی ماں کے لیے روتی تو یہ ماں کہتی—روتی کیوں ہے—میں ہوں نا!

اس طرح اوپر والے کی مرضی سے ماہ در ماہ بیتنے لگے۔نیتو باہر گھومتی ہے۔خوب گھومتی ہے۔قدرت کے نظاروں کا لطف اٹھاتی ہے، صبح کی سہانی ہوا، دوپہر کی تپتی دھوپ، بارش کی رم جھم—ان سب سے اس کا بھرپور تعارف ہے۔

ساتھ ہی بازار ہاٹ کی سجاوٹ، مکانوں کی بناوٹ، سب پر نظر رکھ کر ایشور کی بنائی ہوئی دنیا کی اس ساخت پر مسحور ہو اٹھتی ہے۔اس کا شگون آچکا ہے۔جلد ہی زندگی کی تنہائی دور ہو جائے گی۔

سب کچھ قرینے سے رکھنے کی عادت ڈالتی ہوئی اپنا دھیان مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔رفتہ رفتہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔

کتنا خوبصورت ہے یہ خواب—یہ خواب جو حقیقت بنے گا۔پلکوں پر خوابوں کا دریچہ کھول کر ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول سجائے خود کو پلنگ کے سپرد کردیا۔

موسم کے مسحور کن لمس کا احساس ہوا۔اردگرد خوشیوں کا بسیرا، شیریں آواز، خوشگوار

ماحول کی مستانی جھنکار تنہائی کی آخری سلطنت پر قابض ہو گئی۔

اچانک رات کے سناٹے کو چیرتی، قہر ڈھاتی قدرت کی آواز سے پل بھر میں آب، ہوا، افق، آسمان سب پر تاریکی کا پہرہ لگ گیا۔ چراغ کی روشنی بھی رات کی سیاہی میں گم ہو گئی۔ چاروں طرف چیختی ہوائیں دل کو دہلانے لگیں۔

مستی میں ڈوبی یوگل کی باہوں کا کساؤ ڈھیلا پڑ گیا۔

قدرت کا حملہ محلوں اور پھوس کے مکانوں پر ایک ساتھ ہوا۔ بوڑھے جوان بچوں میں کتنوں کو اس حملے کا لمحہ بھر بھی احساس نہیں ہوا۔ اور وہ آخر شب کے چراغ کی طرح ٹمٹما کر خاموش ہو گئے۔ دھرتی ماں کا دل درد سے اب بھی کراہ رہا تھا۔

ایک ماں کا درد غصہ بن کر اس پر حاوی تھا۔

بڑے بڑے ہولناک درخت ہولناک چیخ کے ساتھ زمیں بوس ہو گئے۔ محلوں اور پھوس کے مکان کے نیچے ہزاروں جانیں لمحہ بھر میں دم توڑ گئیں۔ نیند میں سوئے پودے جاگ کر ایک انگڑائی بھی نہ لے پائے۔

قدرت کے اس غیر متوقع حملے سے کالی رات کے ہونے کا احساس گہراتا چلا گیا۔ گرچہ ایسی دل شگاف آوازیں اس زمین پر در و دیوار سے ٹکرا کر خاموش ہو چکی تھیں۔

سرسراتی ہوائیں چیخ کر خاموش ہو گئیں۔ ویران دہشت، سناٹے اور بھوک کی تلملاہٹ نے اپنوں کی جدائی کا صدمہ منانے کی اجازت نہیں دی۔

بے شمار گھائل، کراہتی زندگی اور بکھری ہوئی لاشیں۔ بجلی کے الجھے تاروں سی الجھی زندگی۔ بانس کی چھاؤنی۔ پیڑ کے پتوں کے نیچے بسی زندگی اب کھلے آسمان کے نیچے آگئی ہے۔ خطرناک طوفانی ہوا کا قہر تھمتے نہیں تھمتا تھا۔ سڑکوں پر پڑی گہری دراریں اور اپنی عظمت و شوکت کھو چکے زمیں بوس درخت۔

ہاتھ پاؤں سے اپاہج اور زخمی جسم کو اسپتال کی کھاٹ بھی میسر نہیں۔

"ارے وہ دیکھو میری بچی کا پاؤں ہے۔" ٹوٹے ہوئے پاؤں کو دیکھ کر ایک عورت چیخ

پڑی۔ جبکہ وہ خود ایک قدم آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔

سارا ملک قدرت کے اس عذاب سے غمزدہ تھا۔

ان بے گھر بار لوگوں کے لیے کھانے پینے کا نظم بڑے پیانے پر کیا گیا۔لیکن اشیائے خوردنی کا سفر اتنا لمبا ہے کہ انہیں پہنچانے والے اپنی فکر کیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ کچھ مصنوعی آفات تو کچھ قدرتی۔

ان مصیبت زدہ لوگوں کے آنسوں پچھلے تیس گھنٹوں سے آسمان سے برس رہے ہیں۔

بالاسور کی سڑکیں پانی میں ڈوب گئی ہیں۔

راحت کارواں سے کسی کو کھانا ملا، کسی کو پانی، کسی کو موم بتی تو کسی کو ماچس اور کسی کو دوائیاں۔ اس طوفان عظیم میں سڑکیں ٹہنیاں اور پتے ان کے مددگار ثابت ہوئے۔ انہیں ٹہنیوں پر راحت کے انتظار میں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

نیتو کے دل کی تمنائیں بھی اس طوفان میں آس پاس کی دیگر چیزوں کی طرح بکھر چکی تھی۔ دل کی سطح پر ابھرنے والی یادوں کے نقوش بھی بارش کی تیز دھار سے مٹ چکے تھے۔ کیچڑ اور ملبے میں پھنسی مردہ لاشوں سے بدبو اٹھنے لگی۔ بدبو سے وبائی امراض پھیلنے کے خطرات لاحق ہو گئے۔

بوڑھی اور بے نور آنکھیں کسی بھی راحت کار کو دیکھ کر چلا پڑتیں۔

''ارے بھئی ہمیں یہاں سے جلدی لے چلو۔'' اسی طرح دوسری کئی آوازیں تھیں۔

''ہمیں کھانے کو مت دو صرف تھوڑا سا زہر دے دو۔''

تیسری طرف موت اور زندگی کی تمنا سے الگ ایک بوڑھا ہاتھ ادھ پکے گوشت کے ٹکڑے کو لیے ہوئے تھا۔ پتوں کو اکٹھا کر کے اس میں ماچس لگایا۔ وہ بوڑھی ہڈی ادھ پکے گوشت کو نعمت اعظمیٰ سمجھ کر تیز رفتار سے کھا رہی تھی۔

ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لینے کے ضمن میں شیر خوار بچہ کی پانچوں انگلیاں بکھر گئیں۔

بوڑھی سانسیں تھکنا نہیں چاہتی تھیں۔

اس منظر کو دیکھ کر فوج کے ایک نوجوان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے اپنے کھانے کی پوٹلی اس کے آگے رکھ دی۔

فوجی نے اپنے ساتھیوں سے کہا—

''یہاں پر ہر آنکھیں ہماری نظرِ عنایت کی منتظر ہیں۔''

تب ایک ایک کر کے دیگر فوجیوں نے اپنا اپنا کھانا متاثرین کے آگے رکھ دیا۔

■■

ٹوٹتی کڑیاں

طویل زندگی اپنی بیماری اور بچوں کی فکر کرتے گذری۔

ریما سارا سارا دن محنت کرتی اس کے باوجود شام کو آدھا پیٹ کھانا میسر ہو پاتا۔ کبھی کبھی خود بھوکی رہ جاتی مگر پتی کو بھوکا نہ رکھتی۔ اگر ایسا کرتی تو اس کا دھرم بگڑ جاتا۔ اپنے ایشور کو بھوکا رکھنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اگر ایسا کرتی تو اس کا ایشور ناراض ہو جاتا۔ پھر وہ اس کے عتاب سے کیسے بچ پاتی۔

پانچ پانچ بچوں کے جنم دینے کے بعد اس کی کوکھ تھک گئی تھی۔ اس میں اب طاقت نہیں تھی کہ وہ چھٹے بچہ کے بوجھ کو اٹھا سکے۔ مگر یہ تو اس کے ایشور کی دین تھی۔ بھلا وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔

جب ریما چھوٹی تھی اپنے باپو کے ساتھ کھیت میں کام کرنے جاتی تھی۔ مینڈ باندھتی، کھیتوں میں پانی دیتی۔ اناج کے گٹھر کو سر پر اٹھا کر گھر گھر پہنچاتی۔ جانور ہانکتی۔ ان کاموں کو کرنے کی اسے عادت تھی۔ اس کی سکھیاں بھی اپنے اپنے باپو کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھیں۔

مگر یہ سارے کام وہ تب تک ہی کریں گی جب تک کہ ان کا بیاہ نہ ہو جائے۔ اس کی ساری سکھیوں کی طرح اس کے بھی ارمان تھے، خواب تھے کہ اس کی شادی شہر میں ہو۔ پتی مزدوری کر کے لائے گا اور وہ رانی بن کر گھر میں راج کرے گی۔ وہ اسے سنیما دکھانے لے جائے گا۔ میلا اور سرکس بھی۔ اسی طرح کے نہ جانے کتنے خوابوں کو دل میں سنجوئے وہ صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتی رہتی۔

گھر کا کام بھی کرتی مثلاً چوکا چولھا کنویں سے پانی نکالنا، گائے کو چارہ دینا، روٹی

سینکنا، گوبر سے گوئیٹھا تھاپنا وغیرہ۔ یہ اس کی روزمرہ زندگی تھی۔

جب وہ چودہ سال کی ہوئی تو اس کی ماں نے اس کا بیاہ کر دیا۔لڑکا اینٹ کے بھٹے پر کام کرتا تھا۔ بھٹا بند ہونے پر دوسرا کام بھی کرتا۔اناج کے بورے ڈھوتا،لکڑی کے بوٹے کو ٹرک پر لادتا، ٹالی کھینچتا۔اتنی ساری خصوصیات کا مالک تھا یہ لڑکا۔شہر میں اس کا مکان تھا۔ماں باپ بھائی بہن سبھی تو تھے۔ایسے بھرے پرے خاندان کا لڑکا تو بڑے بھاگیہ سے ملتا ہے۔اس کی ماں نے جھٹ بیاہ طے کر دیا۔

اب وہ بیاہ کر اپنی سسرال آ گئی تھی۔

اس کا پتی خوب کماتا۔سال بھر کام میں لگا رہتا۔کسی بھی مہینہ گھر میں نہ بیٹھتا۔لیکن گھر میں خرچ کے نام پر ایک بھی پیسہ نہیں دیتا۔گھر کا سارا خرچ اس کا باپو پورا کرتا تھا۔لیکن چھوٹا بھائی مزدوری کے کچھ پیسے گھر میں خرچ کرتا تھا۔

اس کے باپو نے سوچا تھا کہ بیاہ ہو جانے کے بعد شاید وہ گھر میں روپیہ دینے لگے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔

ایک دن اس کے باپو نے کہا۔

''بیٹا کچھ روپئے گھر میں بھی دیا کر۔اب تو پریوار والا ہو گیا ہے۔کم سے کم بہو کا کھرچ تو دینا چاہئے تجھے۔''

تب اس نے جواب دیا۔

''تم لوگوں نے اپنے شوق کی کھاتر بیاہ کیا ہے میں نے کہا تھا بیاہ کرنے کو؟ اب تم ہی کھرچ اٹھاؤ۔''

باپو مایوس ہو گیا۔

کچھ دنوں تک یوں ہی چلتا رہا۔باپو بہو کی خاطر گھر کی لاج بچاتا رہا۔لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن تو بہو کو اس کی کرتوتوں کا سامنا کرنا ہی تھا۔پھر بھی سوچا جب تک نبھ جائے اچھا ہے۔دن مہینہ اور مہینہ سال میں بدلنے لگے۔اس کے ایک اور پھر دو بچے ہو گئے۔

اس کے باپو نے اسے الگ کر دیا۔

بچوں کے موہ پاش میں وہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے پریوار کو لے کر شہر کے ایک کنارے پر رہنے لگا۔

اس گھاس پھوس کی چھوٹی جھونپڑی کو اس نے پانچ ننھے منے بچوں سے بھر دیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ اس کا ایک نجی شوق تھا۔ جسے وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ وہ شراب کبھی نہیں پیتا تھا۔ تاڑی کا شوق رکھتا تھا۔ وہ بھی اکیلے نہیں دوستوں کو پلا کر پیتا۔ اس کا کہنا تھا۔

''اکیلے کھایا پیا تو کیا کھایا۔ مل بانٹ کر کھانا اچھی بات ہے۔ اس سے سوسائٹی میں نام رہتا ہے۔ دل بہلانے کا کوئی تو سادھن چاہئے نا!''

تھکان دور کرنے کے لیے باہر میں دوست یار تھے اور گھر میں بیوی۔ رات میں جب بیوی پاس ہوتی تو سارے دن کی تھکان دور ہو جاتی۔

وہ صرف اس کے جسم کی تپش کو ہی دور نہیں کرتی بلکہ اس کے سر اور پیروں میں مالش کرتی یہ اس کا دھرم جو تھا۔

لیکن شوہر اپنے دھرم کو بھولا ہوا تھا۔ اسے روٹی کھلانا بھاری پڑتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''کھیت میں مزدوری کرنے کی تیری عادت تو تھی ہی۔ محنت کی عادت چھوٹ جائے گی۔ گھر میں بیٹھی بیٹھی تو کیا کرے گی؟ چار گھنٹہ بھٹا پر کام کیا کرے گی تو اس سے تیری کام کرنے کی عادت بنی رہے گی اور میرا بوجھ بھی ہلکا رہے گا۔''

اس نے بیوی کو پیار سے سمجھایا تو وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بھٹے پر چلی گئی۔ ایک کنارے پر بچوں کو بٹھا کر کام کرتی رہتی۔

اسے کام کرتے ہوئے کئی سال بیت گئے۔ اس بیچ اس کے پانچ پانچ بچے ہوئے، چھٹا کوکھ میں چھٹپٹا رہا تھا اس زمین پر آنے کے لیے۔

جب وہ ڈاکٹر کے پاس گئی اور کہا کہ اسے بہت تکلیف ہے، ڈاکٹر نے پوچھا کہ کتنے بچے ہیں اس نے تین بتایا دو چھپا گئی۔

وہ جانتی تھی ڈاکٹرنی اسے ڈانٹے گی۔ چوتھے بچہ پر بھی اس نے بہت ڈانٹا تھا، اور کہا کہ

جسم میں طاقت نہیں ہے تو مرد کو سمجھاتی کیوں نہیں۔اس نے من ہی من سوچا۔ موا سمجھانے سے مانتا ہے کیا تب ڈاکٹرنی نے مفت علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کا اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ بڑی لڑکی گھر کا کام کرتی۔ وہ خود باہر کا کام کرتی۔ مگر سانس پھول جاتی قدم لڑکھڑا جاتے۔

اس کا ماننا تھا کہ اس کی کوکھ سے جتنے بچے جننے لکھے ہیں، وہ پورے ہو کر رہیں گے۔ اس میں اس کا کوئی بس نہیں۔اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

اس بار وہ بیماری کی وجہ سے مرجھا گئی تھی۔ علاج کی فکر موت کا ڈر اور بچوں کا بھوشیہ۔ ان باتوں نے اس کی ہمت کو پست کر دیا تھا۔ محنت کا بار اس سے نا قابل برداشت تھا۔ اگر ریما کو محنت سے آزاد کر دیا جائے، اس کی محنت کا بوجھ اس کا پتی اپنے اوپر اٹھا لے تو وہ اس بچے کو آرام سے جنم دے سکتی ہے۔ ایک طرف بھوک اور بیماری تھی تو دوسری طرف محنت کا بوجھ۔ جس سے اس کا وجود کانپ کر رہ جاتا تھا۔

وہ ہر روز شوہر کو پریشان کرتی کہ وہ اس کا علاج کرائے۔ مگر وہ سنی ان سنی کر دیتا۔

ایک دن اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو پتی نے اسپتال میں بھرتی کر دیا۔ اس دن سے لگاتار وہ اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

اس کی صحت ٹھیک تو نہیں ہوئی۔ لیکن اطمینان ضرور ہونے لگا کہ وہ گھر کی ذمہ داری کو سمجھنے لگا ہے۔ اس کے لیے کھانا لاتا، دونوں وقت آکر دیکھ جاتا۔

دن پورے تھے اس لیے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بچے کی پیدائش تک اسپتال میں ہی رہنا اس کے لیے ٹھیک ہوگا۔ یوں تو وہ گھر جانے کو بے چین رہتی۔ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں کھانا بنا کر کھلانے کو۔ بیٹی کے ہاتھ کا کھانا اچھا تو لگتا تھا۔ یہ بھی اچھا لگتا تھا کہ وہ اس کی سیوا کر رہی ہے۔ اس بات سے وہ خوش تھی۔ شوہر اسے تسلی دیتا رہا کہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی تو گھر لے جاؤں گا۔ باری باری بچوں کو لا کر دکھا جاتا کہ وہ گھر جانے کی ضد نہ کرے۔

اب ریما مطمئن ہو گئی۔ اپنے شوہر کی طرف سے۔ اب اسے اپنی تپسیا کا پھل مل گیا تھا۔ اس کے شوہر کو اس کی زندگی کا موہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ریما کا کچھ برا ہو۔

اسے فکر تھی کہ اگر ریما کو کچھ ہو گیا تو میرے بچوں کو کون دیکھے گا۔ اتنے بچوں کے ہوتے ہوئے وہ دوسرا بیاہ تو کرے گا نہیں۔ مرنے نہیں دے گا، اس کا علاج کرائے گا کسی بھی طرح۔

ریما بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی اس کے انتظار میں چھ چھ جیون اس دھرتی پر ہیں۔ کتنی بھاگیہ وان ہے وہ۔ بچہ جنتے ہی وہ گھر چلی جائے گی۔ کتنا سکھ ملے گا اسے اس کے بچوں کو۔ وہ سوچ میں گم تھی کہ اس کا شوہر کھانے کی پوٹلی لے کر آ گیا۔ کھانا تھال میں سجا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی کھانے کا نوالہ منہ میں ڈال کر وہ رک گئی۔ اس نے پوچھا۔

''کھانا کس نے بنایا ہے۔''

''میں نے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

''کیوں؟ جھملی کہاں ہے۔ ٹھیک تو ہے نا!'' وہ گھبرا گئی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''تو پھر اس نے کھانا کیوں نہیں بنایا، بھائی بہن سے جھگڑا کیا ہے کیا؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

''نہیں جھملی کو میں نے دس ہزار روپئے میں بیچ دیا ہے۔ پورے دس ہزار میں۔''

''نہیں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میری بیٹی کو واپس لا دے میرے بھگوان، میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔''

وہ اپنی پوری طاقت سے چیخ پڑی۔

''اب وہ نہیں آ سکتی، وہ بس سے بہت دور جا چکی ہوگی مہاجن اسے لے کر بہت دور جا چکا ہوگا، دوسرے شہر۔'' پھر تھوڑا رک کر بولا۔

''لیکن گھبرا مت۔ وہ آدمی اس سے برے کام نہیں کرائے گا۔''

''نہیں وہ اس سے برے کام ہی کرائے گا۔ تو نے میری بچی کے ساتھ ایسا کیوں کیا مجھ سے پوچھے بغیر۔'' وہ دوبارہ چیخ پڑی۔

اب کی بار وہ ڈانٹ کر بولا۔

''دیکھ تو چپ رہ۔ جھملی جوان ہو رہی تھی اس کے بیاہ کا بوجھ کون اٹھاتا۔ بیاہ کے جھنجھٹ میں کون پڑتا۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں تھے؟ آخر ایک دن اس جھونپڑیا سے اسے کوئی اٹھا ہی لے جاتا۔ اس لیے میں نے اسے بیچ دیا۔ بڑے مجے میں رہے گی۔ میرے سر کا بوجھ بھی اتر گیا اور تیرے علاج کو روپیہ بھی مل گیا۔ یہ بات کاہے نہیں سوچتی۔ تو اگر اس کا بیاہ بھی کرتی تو کوئی مرد اسے اپنے گھر لے جا کر اس کی پوجا تھوڑے ہی کرتا۔ عورت کا شریر مرد کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ اگر وہ ہی مرد لے گیا تو کاہے کی پھکر۔''

ماں یہ سب سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ چیختی جا رہی تھی۔ تبھی اسے زوروں کا پیٹ میں درد ہوا۔ وہ دوڑ کر نرس کے پاس گیا۔

درد بڑھتا گیا۔ نرس نے انجکشن دیا۔ اب وہ درد کے مارے چھٹپٹانے لگی۔

چھٹپٹانے کے ساتھ ہی ایک کربناک چیخ نکلی۔ اس کے بعد ایک بچی کو جنم دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

■■

خدمتوں کا سلسلہ

سکھ حاصل کرنے کی تمنا انسان کو جدو جہد کرنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ بیٹے کے خوشحال مستقبل کی آرزو کس ماں کے دل میں نہیں ہوتی۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے فکر لازمی تھی۔ اور اس فکر کو سہارا مل گیا تھا۔ خدمت کا سہارا۔

رشیدن بوا کمرے میں جھاڑو لگا رہی تھیں۔ ایک ایک شخص کے جوتے چپل ہٹا ہٹا کر وہ کوڑے نکال رہی تھیں۔ کبھی سر سے پلو ہٹ جاتا تو لجا کر برابر کر لیتیں۔ بھاری بھرکم جسم کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہال نما کمرے کو صاف کر کے اٹھیں تو سانس پھول گئی۔ بیسن میں ہاتھ دھو کر سیدھے باورچی خانے میں گئیں۔

''بے بی جی ذرا چائے دیجئے گا۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

ان کی طرف دیکھتے ہوئے بے بی جی نے کہا۔

''تھک گئیں رشیدن بوا۔''

''نہیں بیٹی بڑی شرم لگے ہے مردانہ لوگ کے بیچ میں جھاڑو دیوے میں۔ کا کریں سنبھال سنبھال کے ڈھیرے ڈھیرے لگا دے ہیں۔''

''اسی لیے کہتی ہوں کہ سویرے آ کر جھاڑو لگا دیا کریں۔ مگر آپ سے تو ہوتا نہیں اور آپ بھی کیا کریں گی۔ ابا جی کے دوستوں کا کوئی وقت تو بندھا نہیں ہے۔ جب دیکھو چار چھ لوگ چلے آتے ہیں۔''

وہ ابا جی کی تعریف کر رہی ہیں یا تنقید۔ رشیدن بوا کو سمجھ میں نہیں آیا۔

جاڑے کے دنوں میں شاعروں کا جمگھٹ کافی رات تک رضا صاحب کے آشیانے کو

گلزار کئے رہتا۔رشیدن بوا چائے پر چائے کے حکم کا پالن مستعدی سے کرتیں۔ چائے کے ساتھ پکوڑے بناتیں اور کبھی چنے اور چوڑے تلتیں۔اس طرح شاعروں کی خدمت کرنا ان کی تقدیر بن گئی تھی۔

وہ خوش تھیں اور پرامید بھی کہ اس گھر میں ان کی موجودگی گمراہ بیٹے کے مستقبل کو روشن کردے گی۔

تین تین بیٹیوں کی پرورش ان کی شادیاں سب اسی گھر کی برکت سے ہو پائی تھیں۔

میم صاحب دریا دل عورت تھیں۔شہنشاہیت کا دور دیکھا اور بھوگا تھا۔دسترخوان وسیع تھا۔غریب، مصیبت زدہ کوئی بھی ان کے در سے خالی نہیں جاتا تھا۔خانساماؤں کی پوری جماعت ان کے یہاں تھی۔دائی نوکر صرف اپنی جان کی ہی پرورش نہیں پاتے تھے بلکہ پورے کا پورا پریوار کھانے، کپڑے سے پرورش پاتا تھا۔

خانساماؤں کے کھانے کی الگ سے تین چار سیر کی دیگچی چڑھتی تھی۔پھر انہیں تسلے میں بھر بھر کے گھر لے جانے کو کھانا دیا جاتا تھا۔رات اور دوپہر دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔رات کو روٹیاں سب کے حصہ کی گن گن کر خود میم صاحب دیا کرتیں۔کوئی بھوکا نہ رہے۔کوئی آدھا پیٹ نہ کھائے۔اس بات کا پورا خیال رہتا۔

رضا صاحب کا بھرا پُرا خاندان تھا۔پانچ پانچ بیٹے بیٹیاں بہویں بھائی بہن سبھی تو تھے۔

عزت شہرت دولت حاصل کرتے کرتے عمر بیت گئی۔رضا صاحب ضعیف ہو گئے۔

رشیدن بوا ان کی احسان مند ہیں۔ان کے پریوار کی جیون نیا اس گھر سے پار لگ گئی تھی۔ بیٹا بھی رضا صاحب کی سفارش سے سرکاری نوکر ہو گیا۔اس گھر کا احسان وہ کیسے چکائیں۔انہوں نے سوچ لیا تھا کہ رضا صاحب اور میم صاحب کی زندگی تک اس گھر کی خدمت میں ضرور گزار دینا ہے۔

لہٰذا جب سے رضا صاحب نے پلنگ پکڑی۔وہ جی جان سے دوگنی طاقت سے ان کی خدمت میں جٹ گئیں۔

روز بہ روز رضا صاحب کی صحت گرتی جارہی تھی دماغی حالت نازک ہوگئی۔ پلنگ پر پڑے پڑے انہیں شیا روگ ہوگیا۔

پورے جسم کو روئی سے پوچھ کر صاف کرنا، پاوڈر لگانا، ان کے کپڑے بدلنا، گھنٹوں تیل مالش اور اس کے بعد فنائل ڈال کر پورے کمرے کی دُھلائی وغیرہ کا کام رشیدن بوا کرنے لگیں۔

وہاں سے فرصت پاتیں تو بہو، بیٹے، بیٹیوں کی خیریت لینے پہنچ جاتیں۔ وہ بیٹے سے امید کرتیں کہ ایک بار ہی سہی تنخواہ کا روپیہ ان کے ہاتھ میں دے دیتا تو وہ خود کو خوش قسمت مانتیں۔ لیکن اس کی تنخواہ پر بہو کی حکمرانی تھی۔ اس گھر میں دو چار دن رکنا بھاری پڑتا تھا۔ پوتوں کو تیل مالش کرنا، کٹھوتی بھر کپڑے ملنا، دال بھات ابالنا یہ کام فوراً ان کو کرنے کو مل جاتا۔ روپیہ کے نام پر پچاس روپیہ کرایا بھاڑا بیٹا دے دیتا تھا۔

رضا صاحب کی وہ جی جان سے خدمت کر رہی تھیں۔ دل میں ایک لالچ گھر کر گئی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد جب ان کی قیمتی چیزوں کا بٹوارا ہوگا تو اس میں سے وہ حقدار ضرور ہوں گی۔

لیکن اس تعلق سے انہیں مایوسی ہی ہاتھ لگے گی اس کا اندازہ نہیں تھا۔

کلو کی ماں نے جب یہ خبر سنی کہ رضا صاحب ختم ہوگئے تو دہاڑے مار کر رونے لگیں۔ برسوں وہ بھی ان کی خدمت میں رہ چکی تھیں۔

سارا دن کام کرتی رہیں اور روتی بھی رہیں۔ رات کو جب میرے پیروں میں تیل مالش کرنے بیٹھیں تو رضا صاحب کا قصہ سنانے لگیں۔

''ان کے دروازے پر نائی دھوبی، چمار، دساد بھی جاتے تھے۔ اور وہ بھی کو بغیر کچھ ہاتھ میں دئے ہوئے نہیں لوٹاتے تھے۔ بیوی کو بھی حکم دیتے۔ کچھ کھلا دو نہیں یا چائے ہی پلوا دو۔''

ایک دن کی بات ہے رضا صاحب بغیر کچھ کھائے پئے اپنے کمرے میں قید ہوگئے۔ زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ لوگ انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔

''براہ کرم آپ چپ ہو جائیں اور حکم کریں۔ کیا بات ہے، ہم لوگ ضرور آپ کے حکم کا پالن کریں گے۔'' بڑے بیٹے نے التجا کی۔

لیکن انہوں نے اب تک اپنا منہ نہیں کھولا تھا۔ صرف اتنا ہی کہا۔

''ہم جو بات کہیں گے مانو گے نہیں نا!''

''مانیں گے ابا حضور۔ آپ حکم تو کیجئے۔'' کئی لوگ ایک ساتھ بول پڑے۔ آخر رات گئے انہوں نے بڑے بیٹے کے سامنے منہ کھولا۔

''صبح کلو کی ماں کو بلانے ان کے گھر گیا تھا۔ میں نے دیکھا معصوم بچے اور کلو کی ماں بیٹھے ککڑی کھا رہے ہیں۔ ککڑی والا دروازے پر مل گیا۔ وہ بچی ہوئی ککڑی پڑوسی کو دے کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کئی دن سے کلو کے گھر چولہا نہیں جلا۔ کلو کی ماں جس گھر میں کام کرتی ہے۔ وہاں سے اب کھانا گھر لانے کو نہیں ملتا۔

ایک روپیہ تنخواہ ملتی ہے اسی میں گھر میں دیا بتی جلے گی کہ چولہا۔ ان بچوں کو دیکھ کر میرا جی نہیں چاہا کہ میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔ ایک بے بس عورت اور پانچ پانچ بچے۔ ایک رپیہ میں کیسے پوساوے گا۔ تم میرے بچے ہو۔ میری بات مانو۔ ان سب کا کھانا پکوا کر بھیجو۔ اور تب تک بھیجتے رہو۔ جب تک اس کا باپ مستقل کام کاج نہ کرنے لگے۔''

کلو کا باپ ہٹا کٹا نوجوان مہینوں غائب رہتا۔ کچھ کماتا بھی تو پی پا کر ادھر ادھر پڑا رہتا۔ نہ بچوں کی خبر لیتا نہ بیوی کی۔ وہ جانتا تھا کہ بیوی جھاڑو برتن کر کے بچوں کا پیٹ پال لے گی۔

کلو کی ماں جو اب ہماری بوا ہیں، بتاتیں ہیں کہ تیسوں دن کا کھانا بھر پیٹ چاول دال سبزی ترکاری ملتی تھی۔ اتنا ہی نہیں رضا صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ جب کلو کا باپ آجائے تو اس کا بھی کھانا بنوا کر لے جایا کرو۔ تم اس کا پورا خیال رکھو۔ وہ ضرور ایک دن سدھر جائے گا۔

بچوں کو چار بجے کٹوری میں تھوڑا تھوڑا دودھ اور روٹی دلواتے۔ میرے سب بچے کے تن پر کپڑا انہیں کے دم سے رہتا تھا' کہتے ہوئے بوا اپنے آنسو پھر سے پوچھتی ہیں۔ پھر تھوڑا رک کر بتاتی ہیں۔

''رضا صاحب مشاعرہ سے لوٹ کر آتے تو سب دائی نوکر کو روپیہ بانٹتے رہے۔ کہتے کہ ای سب کا بھی حق بنتا ہے۔''

آخری وقت میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ کسی بھی آنے والے کو دیکھ کر اپنی جیب ٹٹولتے۔ لیکن بیماری کے سبب آواز میں نقاہت تھی کچھ بول نہیں پاتے۔ وہ اپنی جیب میں سکوں کی کھنکھناہٹ اور نوٹوں کی کھڑ کھڑاہٹ سننے کو بے چین رہتے۔

جسم سے لاغر اور ضعیفی کے باوجود رضا صاحب اپنے پریشان حال لوگوں کو اشارے سے بیٹھنے اور کچھ کھلانے کو ضرور کہتے۔

بوا بتاتی ہیں کہ آخر ایک دن اپنی پیروی سے کلو کے ابا کو انہوں نے نوکری دلا کر ہی دم لیا۔

رشیدن بوا رضا صاحب کے مرنے کے بعد اپنے بیٹے کے پاس آگئیں۔ ایک زمانے سے شوق تھا کہ گھر بیٹھ کر بیٹے کی کمائی کھائیں۔ جیون بھر دوسروں کا حکم مانتی آئی ہیں۔ اب خود حکم چلائیں۔ کب سے اس امید پر جی رہی تھیں کہ بیٹے کی نوکری لگے تو چین سے گھر میں رہیں گی اور سب سے خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ عزت کے ساتھ رضا صاحب کے فرض سے بھی سبکدوش ہوگئی تھیں۔ ان پر مطلب پرست اور بے ایمانی کا الزام نہیں لگا۔

لیکن سوچا ہوا صدفی صد سچ ہو ضروری نہیں۔ بہو نے ان کا جینا حرام کر دیا۔ کٹھوتی بھر بھر کے کپڑے بھگو دیتی۔ بچوں کو نہلانے دھلانے اور اسکول پہنچانے کے ساتھ ہی برتن مانجھنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ اور تو اور دو چار باتیں بھی سنانے لگی۔ کھانے کے نام پر رات کی روٹی یا بھات ترکاری۔

اکثر بہو بیٹے کے ساتھ باہر گھومنے نکل جاتی اور کھانا باہر ہی کھا کر آتی۔

جبکہ رشیدن بوا کو بھنے گوشت تلی ہوئی مچھلی کھانے کی عادت تھی۔ اب طرح طرح کے اچار چٹنی مربے کی خوشبو انہیں ستانے لگی۔ برسوں سے وہ ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہاں تھیں تو ہاتھ میں ہر وقت پیسہ رہتا تھا۔ آنے جانے والے دس پانچ دے ہی دیا کرتے۔ اس پر سے گرم کپڑوں کی بھی بھرمار تھی۔

ناشتہ کھانا بھر پیٹ کئی کئی بار چائے۔

رشیدن بوا ایک دن روتے ہوئے ہمارے پاس آئیں۔ کہ بیٹا ذرا بتایئے کہ ہم آفس میں درخواست دیں کہ بیٹا میرے ایک پیسہ نہیں دے ہے۔ ماں کا حق بنے ہے کہ نا! بیوی کا حق سرکار دے ہے۔ مائے کا نا دے گی۔

میں نے پوچھا پہلے بتائے تو کیا بات ہے۔ پہلے بتائے؟ تب کچھ کیا جائے گا۔ او بیٹا میرا بولس کہ جب تک میرا بال بچہ چھوٹا ہے تبے تک ہم تمرے رکھے ہوئے ہیں۔ بچہ میرا پوسا جاوے گا تو ہم تمرے بھگا دیویں گے جا کے بٹی کنے رہیو۔ بتائے تو کہ اوس میرے تو نوکرانی کی جگہ رکھے ہوئے ہے۔

ہم اس کے لیے غیر کا جوٹھا برتن دھویا۔ غیر مردانہ کے سامنے چائے ناستہ لگایا۔ ایہی دن لا کہ اس کا نوکری لگ جائے تو ای میرے نوکرانی سمجھے۔ وہ روتی رہیں اور ہم انہیں سمجھاتے رہے کہ آفس میں کہنے سے پہلے ہم اسے سمجھائیں گے۔

کچھ دنوں تک ہم لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر بیٹے کا سلوک اچھا رہا۔ لیکن رشیدن بوا کو سکون نہیں تھا۔

بٹی کے پاس کچھ دن رہیں۔ دل نہیں لگا۔ لوٹ کر بہو کے پاس آئیں۔

یہاں پر تلی مچھلی، بھنے گوشت اور طرح طرح کے کھانے کو ترس گئیں۔

ماحول پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوتا چلا گیا۔

بہو بیٹے سے ماں کی ایک منٹ بھی نہیں نبھتی۔

چارو ناچار رشیدن بوا پھر سے رضا صاحب کی بہوؤں کی خدمت میں حاضر ہو گئیں۔

■■

در کتے درپن

بند دروازے کی لکیر سے آرہی روشنی میں دیکھا کہ ممی اپنی ممتا کے آنچل سے امرت نکال رہی تھی۔ تیرہ برس کی ریچا اس آواز کو سمجھ نہ سکی۔ بس ایک تجسس کے زیر اثر تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ ماں کی ممتا کے آنچل میں دودھ، یہ سوال ریچا کو بے چین کرنے لگا۔ اگر دودھ ہے تو معصوم کہاں ہے؟

بغیر بچہ کے ممتا کا امرت نہیں اترتا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی۔ لیکن ممی سے اس کے متعلق آگے جاننے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

ممی گذشتہ آٹھ دن پہلے نینی تال سے لوٹی تھی۔ گزشتہ آٹھ دس ماہ سے وہ نینی تال میں رہ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کی صحت کی خرابی کے پیش نظر اسے پہاڑی علاقے میں رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ تبھی سے ببلو اور ریچا رنجنا موسی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ممی آفس سے سال بھر کی چھٹی لے چکی تھی۔ اتنا سب ریچا کو زبانی یاد تھا۔ تب ایک ایک دن ممی کو یاد کر کے ببلو اور ریچا رنجنا موسی کے ساتھ رہتے ہوئے دن گن رہے تھے۔ ممی کب آئے گی۔ کب آئے گی۔ پوچھتے ہوئے اب وہ رنجنا موسی کے ساتھ رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

رنجنا موسی دیپو ماما اور نانا یہی ان کا پریوار تھا، خاندان تھا۔ ممی اب اتنے دنوں بعد آئی ہے۔ لیکن پیار اور ممتا کا رشتہ پرایا معلوم ہو رہا ہے۔ موسی ہی سب کچھ ہے۔ اس میں تکلیف کیسی۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر موسی کے پاس آئی۔ مگر اپنے سوال کے اظہار کے لیے لفظوں کا انتخاب کرنے میں وہ ناکام رہی۔

لہٰذا گنگ بیٹھی رہی ۔ چند ساعت بعد اٹھ کر ٹہلنے لگی ۔ اس سے بھی تسکین حاصل نہ ہوئی تو کتابیں دیکھنے لگی ۔ لیکن جب اس سے بھی اس کی اضطرابی کیفیت قائم رہی تو وہ دوبارہ سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر گئی ۔ دروازہ کھل چکا تھا ۔

ممی کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگئی ۔ ممی اب اسے خوف زدہ کرنے لگی تھی ۔ یوں بھی ممی اب اسے اتنا پیار نہیں کرتی جتنا پہلے کرتی تھی ۔ وہ زیادہ تر چپ رہتی ۔ بالکل کھوئی کھوئی سی ۔ ببلو زیادہ تر باہر رہنے لگا ۔ لہٰذا اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ ممی پہلے جیسی ہے یا نہیں ۔

موسی کو اپنی کربناک کیفیت سے آگاہ کرنے میں اسے کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوتی ۔ لیکن یہاں بھی فطری حیا مانع تھی ۔ تو پھر کیا کیا جائے ۔ اس کی الجھن اسکول میں جا کر مزید بڑھ گئی ۔

اس نے اپنی سہیلی سے پوچھا ۔

''تیرا بھائی کتنا بڑا ہے؟''

''بہت چھوٹا سا! ابھی تو دودھ پیتا ہے ۔'' دودھ کا سن کر دل میں کچھ اور جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا مگر تجسس کا حل اتنا آسان نہ تھا ۔

ممی دس دن کے بعد دوبارہ جانے کو تیار ہوگئی ۔ تب ریچا نے بھی چلنے کو کہا ۔ لیکن ممی بگڑ گئی ۔ پڑھائی کی فکر نہیں ہے ۔ یہیں رہو ۔ موسی کے پاس وہ رونے لگی ۔ بجائے اس کے کہ ممی اسے سمجھاتی بہلاتی وہ بگڑ گئی ۔ کسی چیز کی لالچ بھی نہیں دیا کہ تمہارے لیے کپڑے لاؤں گی، کھلونے لاؤں گی ۔ کچھ بھی نہیں ۔ وہ ایسی کیسے ہوگئی ۔ پچھلی بار تو ایسا نہیں ہوا ۔ اس کے من کو چوٹ پہنچی ۔ اس کا آئینہ جیسا صاف وشفاف دل شکستگی کے آڑے ترچھے خطوط سے بھر گیا ۔

اسے پاپا بے طرح یاد آگئے ، لیکن انہیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ۔ وہ تو آئیں گے نہیں ۔ بھگوان کے پاس سے کوئی واپس نہیں لوٹتا ۔ اسے تو پاپا کی صورت تک یاد نہیں ۔ اب تک صرف تصویروں سے ہی باتیں کرتی رہی ہے ۔ ببلو اس سے بڑا ہے ۔ لیکن بالکل بدھو ۔ لیکن اس سے کچھ کیسے کہے کہ اسے ممی کے بغیر اچھا نہیں لگتا ۔ ممی ساتھ تھی تو ہم سب کتنے خوش تھے ۔ پڑھائی میں بھی دل لگتا تھا ۔ اب تو دل بالکل ہی اچاٹ لگتا ہے ۔ نہ پڑھائی میں من ، نہ گھر میں اور نہ کسی

کھیل یا تفریح میں دل لگتا۔ میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری رنجنا موسی دن رات کرا رہی تھی۔ کیوں کہ اگلے سال ریچا میٹرک کا امتحان دے گی۔

اب موسی میٹرک کے امتحان کے ساتھ ہی یہ بھی کہنے لگی کہ اسے اب ہاسٹل میں ڈال دیا جائے گا۔ کیوں کہ موسی کی شادی ہونے والی ہے۔ ببلو تو اکیلا رہ جائے گا۔ مگر ریچا۔

ممی تو ہمیشہ ہی علاج کے لیے باہر جاتی رہے گی۔ اس لیے اسے ہاسٹل میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں اسے پڑھائی میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے۔

یہ سن کر ریچا خوش نہیں ہوئی۔ بہت ساری فکروں نے اسے اپنا اسیر بنا لیا۔ اسے تو صرف اپنی ممی چاہئے۔ اپنا گھر چاہئے، انجان ماحول نہیں چاہئے۔

مجھے پڑھائی نہیں کرنی ہے۔ میں پڑھائی چھوڑ دوں گی۔ صرف گھر پر رہوں گی۔ اس نے سوچا لیکن اس کے جذبات کی فکر کسے تھی۔

ممی آتی رہی جاتی رہی۔ اسی مایوسی کے ماحول میں اس نے میٹرک کر لیا۔ ہاسٹل میں رہ کر اسے ببلو کی یاد خاص کر آتی۔ ممی سے اسے نفرت تھی۔ رنجنا موسی بھی بے وفا ہے۔ جو اسے چھوڑ کر اپنے اجنبی دولہا کے ساتھ چلی گئی۔ اس کا پیار بھی نقلی تھا۔ دور رکھ کر اسے اذیت دی جا رہی ہے۔ اسے ہاسٹل بھیج کر ممی بے خبر اور مطمئن ہو گئی۔ اس کے ساتھ یہ کیسا برا سلوک ہو رہا ہے۔

جب جب ممی سے جدائی کے دکھ کا جذبہ دل میں موجزن ہوتا۔ تب تب ممی کے تئیں حقارت و نفرت شدید ہوتی جاتی۔ ماں کے چہرے کا عکس دل میں ابھرتا مگر جلد ہی اسے پرے ڈھکیل کر وہ پاپا کی یادوں میں کھو جاتی۔ اگر وہ ہوتے تو ممی کی ساری شکایتیں ان سے کر دیتی۔ اور خوب ڈانٹ پڑتی ممی کو۔ سوچتے ہوئے وہ اداس سی ہو گئی۔

ممی بار بار نینی تال کیوں جاتی ہے۔ پوری قوت کے ساتھ وہ ہر بار وہ پوچھنا چاہتی مگر پوچھ نہیں پاتی۔ وہ اس کے سامنے اپنے مصروف اور سنجیدہ رہنے کا ناٹک کرتی ہے یا کہ چپ لگا کر مطمئن رہنا بہتر لگتا ہے۔

ممی میں ایسا کیا ہے جو وہ اس کے لیے بے چین ہے۔ پریشان رہتی ہے۔

یہاں ہاسٹل میں دوستی کرنے کو لڑکیاں ہیں، باتیں کرنے کو یہ سب ہیں، پڑھنے کو

کتابیں ہیں، کھیلنے کو میدان اور کیرم وغیرہ ہے۔ وقت سے کھانے کو تو مل ہی جاتا ہے۔

ممی کے برے سلوک کے سبب ان کے ساتھ رہنے کی چاہت اس کے من میں ختم ہورہی تھی۔

پھر بھی دل کے نہاں خانے میں بے چینی تڑپ اور غم والم کا طوفان منڈلاتا رہتا۔ ہاسٹل میں رہ کر پڑھتے ہوئے اس نے کبھی سوچا تھا۔ ممی جب آئے گی تو اپنی سہیلیوں سے ملائے گی۔ لیکن اندر کے غصے نے ایسا کرنے سے روکے رکھا۔ ممی آتی ہے تو کیا ہوا کچھ ہی دیر میں چلی جائے گی۔ وہ اسے لینے تو نہیں آئی ہے کہ وہ خوش ہو۔

ببلو کیسا ہے؟ اسے نہیں لائی؟

''ٹھیک ہے۔ تجھے یاد کرتا ہے۔''

صرف اتنا ہی کہا- کیوں نہیں لائی اس کا جواب نہیں دیا۔

ڈھلتی دھوپ جب بڑھنے لگی تو ممی چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ دور تک دیکھتی رہی جب تک اس کا سایہ بھی دھندلا کر چھپ نہ گیا۔

رات میں بستر پر لیٹ کر سہیلیوں سے ہلکی بات چیت کے بعد چادر منھ پر رکھ کر سوگئی۔ مگر نیند اچاٹ تھی۔ پاس پلنگ پر شیلا نے کہا-

''آج تو نے ریچا کی ممی کو دیکھا۔ کیسی گہری نیلے رنگ کی ساڑی پہنے تھی۔ کان میں بالی، پاؤں میں پائل، ناخن میں پالش۔''

''تو کیا ہوا۔'' شیلا نے متعجب ہو کر کہا-

''اے تو تو ایک دم بدھو ہے، ریچا کے پاپا نہیں ہیں نا!''

''نہیں۔'' شکن نے گردن ہلا کر تصدیق کی۔

''تو اس کی ممی 'ودھوا' ہوئی۔ اور 'ودھوا' کو سنگار کرنا شوبھا نہیں دیتا۔''

ریچا کا من ہوا اٹھ کر چلائے چیخے، آگے بولنے سے منع کرے۔ مگر اپمان کا گھونٹ پی کر چپ چاپ پڑی رہی۔ ممی کی شیشے کی مورتی اس کے من کے بھیتر درکتی چلی گئی۔

■■

ایثار کا المیہ

اس نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شوہر شراب پینے لگے گا۔ اور اسی رات اس نے سوچ لیا— 'قصہ اب آگے نہیں بڑھے گا۔'

اس کا انگ انگ نفرت سے سلگ اٹھا، ایسا کیسے ہوگیا؟ مجھے یہ کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ تو کیا نوکری چھوڑ دوں۔ اسی سے یہ نقصان ہوا ہے۔ دن رات خود کو مصروف رکھنے کا ہی نتیجہ ہے۔ نینا کی معزز نوکری کے باوجود یوگیش اس پر شک کرتا ہے۔ ساری ساری رات جاگ جاگ کر کاٹتا ہے۔ ساری رات جاگنے کے بعد وہ صبح سویرے اٹھ کر گھر سے باہر چلا جاتا۔ نینا کے آفس جانے سے پہلے ہی۔

ٹیلی فون آفس میں رات کی ڈیوٹی دے کر جب بھی وہ آتی ہے۔ یوگیش نشے کی حالت میں اسے گھورتا ہوا ملتا ہے۔ جیسے وہ کوئی پاپ کر کے آرہی ہو۔ کسی سے بات کرنے یا ساتھ رہنے سے عورت بد چلن ہو جاتی ہے کیا؟ نینا سوچتی۔ جب بھی وہ جاننا چاہتی ناراضگی کا سبب، وہ آنکھیں چرا لیتا۔

دن بہ دن دونوں کے تعلقات ناخوشگوار ہوتے گئے۔ جب بھی اس کی رات کی ڈیوٹی ہوتی تو وہ باہر نکل جاتا۔ نینا تھکی ہاری آکر اس کے انتظار میں اور زیادہ تھک جاتی۔

وہ آتا، اسے دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنستا اور بستر پر لیٹ جاتا۔ نینا کو اس کی سانسیں اپنی جانب کھینچتیں۔

اس کی پیٹھ سے ہاتھ پھیرتا ہوا پیٹ تک لے جاتا اور پھر ہٹا لیتا۔ اس کے جسم میں سہرن دوڑ جاتی۔ اس کی قربت کے لیے تڑپ اٹھتی۔ ہاتھ بڑھا کر خاموش الفاظ سے اسے پاس بلاتی۔

لیکن وہ اسے چھوڑ کر بستر سے الگ ہٹ جاتا۔

اس کی نگاہوں کی تپش، اس کے خاموش الفاظ اور لمس کانٹے کی طرح اس کے من اور جسم میں چبھتے رہتے، کاش وہ کچھ بول ہی دیتا تو نینا بھی اپنی صفائی پیش کر کے من کی بھڑاس نکال لیتی۔ مگر وہ خاموشی سے اور اپنی سنجیدگی سے وار کرتا رہا اور وہ گھائل ہوتی رہی۔ اگر شوہر کو چھوڑ دے تو سماجی وقار دھول میں مل جائے گا۔

شادی جیسے پاکیزہ بندھن ٹوٹ جانے پر کوئی بھی سماج کوئی بھی قانون اسے دوبارہ عزت نہیں دے سکتا۔ نہ اپنی نظر میں نہ سماج کی نظر میں باوقار مقام دوبارہ مل پاتا ہے۔

اس کے سامنے رینو کی مثال تھی، جو شوہر کو تیاگ چکی تھی اپنے غرور کے سبب کہ وہ اکیلے رہ لے گی۔

جی توڑ محنت سے خود کفیل تو بن گئی۔ لیکن سماج میں بن بیاہے وہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا اندازہ نوکری میں آنے کے بعد ہر لمحہ محسوس ہوا۔ اپنی کمی کے سبب دن بہ دن وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی گئی۔

آج ایک شادی لوگوں کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ لڑکیوں کو دوسری شادی کے لیے کون پوچھے۔ آج کے شادی شدہ مرد کنواری لڑکی تلاشتے ہیں۔ دوسرے اسے ہر وقت اس بات کا خدشہ لگا رہتا کہ کب کون اسے طعنہ دے کر اس کے غم کو دوہرا کر دے۔

دوہری زندگی کو جھیلتی ہوئی وہ تکلیف دہ زندگی جی رہی تھی۔

آج اس نے شراب پی ہے۔ یہی حال رہا تو شراب اسے پینے لگے گی۔

نینا نے یوگیش کو اپنے وجود میں سرور کی طرح محسوس کیا ہے۔ اس کا لمس آنکھوں کی تڑپ کو اس نے محسوس کیا ہے۔ اس کی روزمرہ کی روداد کو اوڑھ رکھا ہے اسے اتار کر کیسے پھینک دے؟

اس کے ہونٹ تھرتھرا اٹھے، گلا بھر آیا، آواز نہیں نکل پاتی تھی کہ اس سے کہے۔ وہ اسے اپنی آغوش مین بھر لے۔ مدہوش کر دے۔ جو اس کی آتما اور من مانگ رہا ہے، جی کھول کر وہ اسے دے دے۔ کس کے لیے وہ سب کچھ بچا رہا ہے۔

وہ سننا چاہتی تھی، جاننا چاہتی تھی۔ کیا کوئی اور دل و دماغ میں ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی اسے سننے کو یوگیش تیار نہ تھا۔

خلاء میں جواب کی تیاری کرتے ہوئے آنکھیں آسمان کی جانب اٹھتیں۔ قربت کی چاہت میں بیقرار من اپنی ہمت کھو بیٹھتا اور آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔

سب کچھ برداشت کرتی آئی ہوں بچپن سے ہی۔ یہ بھی برداشت کرنا ہی ہوگا۔

میرے پاس جو کچھ تھا میں نے اس کی پوجا میں لگا دیا ہے۔ دھیان، گیان، من، شریر سب اس کی تپسیا میں لگا دیا ہے۔ یہ دکھی من، تھکا جسم، بکھری سانسیں اب کسی لائق نہیں رہیں۔

نوکری سے ریزائن دے کر آئی تو من ہلکا تھا۔ جیسے کوئی بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ سوچتی رہی اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ دھیرے دھیرے زندگی معمول پر آجائے گی۔

وقت گزرتا رہا لیکن وہ اجنبی ہی بنا رہا۔ اب وہ اس کی اور زیادہ رحم و کرم کی محتاج ہو گئی۔ ہر لمحہ کھٹکا لگا رہتا کہیں تعلقات ٹوٹ نہ جائیں۔ ٹوٹنے کے موڑ پر کبھی نہ پہنچے۔ اس کے لیے وہ اس کی ایک ایک بات پر دھیان دیتی۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی بڑھ کر پیش کر دیتی۔

مرد یہی چاہتا ہے تو یہی سہی۔ اسے کوئی شکوہ نہیں، وہ کمیوں میں ہی بسر کر لے گی۔ اپنے من کو مار لے گی۔ کسی چیز کی خواہش من میں جنم لے اس سے پہلے ہی اسے کچل دے گی۔ لیکن شوہر کی سرپرستی سے کبھی آزاد نہیں رہے گی۔ اس کا تحفظ اس کی سرپرستی اسے چاہئے ہی ہر حال میں۔

کئی دنوں بعد نینا کے آفس سے ساتھی آئے اس کے استعفٰی دینے کی وجہ جاننے۔

اس وقت یوگیش کی جلتی نگاہوں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

سات برس کی نوکری کو اس نے اپنے پیار اپنے شوہر کے لیے چھوڑ دیا۔ تو کیا اس کی عزت میں کمی آگئی۔ اسے لوگ برا تو نہیں کہیں گے۔ بد چلن تو نہیں کہیں گے۔ لیکن شوہر کو چھوڑ دے گی تو یہ ساری ڈگریاں اسے فوراً مل جائیں گی کہ اس نے اپنے عیش کے لیے شوہر کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کے راستے میں رکاوٹ تھا۔

گاہے بہ گاہے لوگ اس سے ملنے آتے رہے۔ آفس کے جان پہچان کے لوگ۔ لیکن شوہر کے شک کرنے کی بات بتا کر اسے مذاق نہیں بنانا چاہتی تھی۔ لہٰذا کبھی بھی انہیں گھر آنے

سے منع نہیں کر سکی۔ لیکن اس کے نظر انداز کرنے اس کی بے رخی سے وہ ٹوٹتی بکھرتی رہی۔
ایک ہی چھت کے نیچے ان کی ملاقات ایک اجنبی کی طرح ہوتی۔ چپ چاپ بغیر کسی دلار منوہار کے وہ اپنی ضرورت پوری کرتا۔ جس سے اس کا من اور آتما دونوں ہی پیاسی رہ جاتی۔ اسی انچاہے پیار سے بچے بھی سنسار میں آتے رہے۔ ایک دو اور پھر تین۔
بچے آپسی بات چیت کا ذریعہ تو بنے لیکن سنجیدگی جیوں کی تیوں بنی رہی۔ سنجیدگی پرت در پرت بن کر اس کے وجود کو ڈھکتی چلی گئی۔ خاموشی سے وہ اپنے بچوں کی خوراکی اور بقیہ ضرورتوں کے روپیہ دے دیتا۔ اتنا کہ دوبارہ نہ مانگنا پڑتا۔ دل کو کبھی اپنی خاموشی سے کبھی طنز سے گھائل کرتا رہا۔ کھل کر بات کرنے کی سادھ، تمنا اس کی ادھوری ہی رہی۔
اس کی غلطیوں پر جھڑکنا، طنز کرنا، بچوں کو کسی بات کی کمی ہونے کے سبب اسے ہی قصوروار ٹھہرانا۔ جیسے وہ صرف اس کے ہی بچے ہوں، نینا کے نہیں۔
ایک دن شوہر کے ٹرانسفر کا حکم آ گیا۔
وہ خوش ہوئی اور سوچنے لگی۔ تھوڑا دور رہیں گے تو محبت بڑھے گی۔
یوگیش ٹرانسفر کر کے چلے گئے۔
دو ماہ بعد پہلی بار جب یوگیش نوکری سے لوٹے تو بہت خوش تھے۔
اس کی مسکان دیکھ کر نینا کو چین ملا۔ اس کی تپسیا کامیاب ہوئی۔ سوچ کر وہ جھوم اٹھی۔ جسم میں نئی جان آ گئی۔
وہ لذیذ کھانا پکانے کے بعد جلد از جلد اس کے پاس کمرے میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ اکیلے میں محبت کے پل گزاریں گے۔ وہ کام سے فرصت پا کر کمرے میں پہنچی۔ جہاں یوگیش بچوں سے باتیں کر رہا تھا۔ بچے بھی خوش تھے۔
''رنکو بیٹے بتاؤ تو گھر میں کون کون آتا ہے؟'' وہ بیٹے سے پوچھ رہا تھا۔
یہ سن کر نینا کے دل میں بیٹھی یوگیش کی مورتی بہت اونچائی سے گر کر ٹوٹ گئی۔ اپنی تمام خواہشوں کو تیاگ کر بھی وہ پاکیزہ دامن ثابت نہ ہو سکی۔ شک کے بندھن سے آزاد نہ ہو سکی۔

■■

شک کی صلیب

نوین نے ٹھنڈی سانس لی۔ اب کیا ہوگا؟ مینو چلی گئی۔

اس دکھ کی بدلی سے نکلے چاند کوتو ڈوبنا ہی تھا۔ لیکن ایسے کیسے ڈوب گیا۔ اسے تو میں نے مٹھی میں قید کرر کھا تھا۔

اس کے سہارے تو میں نے ساری زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ چاند نیم کی اوٹ سے نمودار ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ چاند آسمان سے اتر کر اس کی جھولی میں آگیا تھا اور اس کی زندگی روشن ہوگئی تھی۔

ہاں مجھے یاد ہے میں نے اسے چاند سے ہی تعبیر کیا تھا۔ ہاں وہ چاند ہی تو تھا جس سے روشنی ملتی تھی، دل و ماغ کو ٹھنڈک نصیب ہوتی تھی۔ ذہن میں تازگی آجاتی تھی۔ اب وہ روشنی غائب ہوگئی۔ وہ چلی گئی۔ وہ چلی گئی میری زندگی میں اندھیرا چھا گیا۔ میرا من اچاٹ کیوں لگ رہا ہے۔

"چلو شیل چلو۔" نوین اٹھ کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے بھی وہ بولے جارہا تھا۔

"شیل، اگر میں نے کل کی فکر کی ہوتی اور اسے شک کی صلیب پر نہ لٹکا تا تو آج یہ دن اتنا بھیانک، بدصورت اور خوفناک نہ ہوتا۔ کب وہ لوٹے گی، لوٹے گی بھی— شیل نے گھوم کر میری طرف دیکھا پل بھر وہ رکا پھر بولا۔

"جدائی مجھے برداشت نہیں ہورہی۔ میں بیمار ہوگیا ہوں نہ! وہ آجائے تو وہ پوری طرح صحت مند ہو جاؤں۔"

اس دن لوٗ چل رہی تھی۔ جب وہ نراش ہوکر میرے پاس آئی تھی۔ لوٗ کی تپش اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

اس دن کوئی اچھی خبر تھی۔ ہم تین لوگ مٹھائی کی پلیٹ سامنے رکھے گفتگو کر رہے تھے۔ تبھی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کچھ لوٗ کی تپش کچھ زندگی سے نراشا، پنکھے کی ٹھنڈی ہوا لگتے ہی کچھ راحت ملی۔ اپنے بالوں کی ترتیب درست کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیگ سنبھالے ہم تینوں کو دیکھ کر وہ جھینپ گئی۔ اپنی بے ترتیبی پر مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور اپنے آگے کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ جھٹ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پلیٹ دوبارہ میرے آگے بڑھا دی، آپ کھائیے۔

میں نے پھر اس کو کھانے کا اشارہ کیا۔ اور بوا کو آواز دے کر ایک پلیٹ اور لانے کے لیے کہا۔ تب وہ چپ بیٹھ گئی۔

یہ لڑکی بدصورت، انپڑھ یا پردے میں رہنے والی نہ تھی۔ صرف غریب پریوار کی تھی۔

''میں آپ سے مدد لینے آئی ہوں۔ مجھے مدد ملے گی؟'' کہتے ہوئے مطلوبہ کاغذات میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے زور سے کہا۔

ٹھیک ہے۔

وہ پھر تیسری بار آئی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''کیوں بار بار آتی ہو۔ پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ تمہارا کام نہیں ہوسکتا۔ بغیر بتائے کیوں نہیں سمجھ پاتی ہو۔''

سن کر اس کے من کو ایک جھٹکا لگا۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ لوٹ گئی۔ ٹوٹتے سپنوں کی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

اس دن کے بعد میں سو نہیں سکا تھا۔ ہر روز سپنا دیکھتا کہ وہ آئے گی۔ مگر اب کیوں آئے گی؟ اسے تو میں نے کہہ دیا تمہارا کام نہیں ہوسکتا۔

میرا اس کی ضرورت سے ایک انجانہ رشتہ قائم ہوگیا تھا۔

دو ماہ کے بعد کا وہ دن۔ جب صبح سے ہی بادل گھرا تھا۔ اور رہ رہ کر بارش ہو رہی تھی۔

میں برآمدے میں بیٹھا بارش کے نظارے میں کھویا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

''تم کہاں چلی گئی تھی مینو'' دل کی گہرائی سے اداسی میں ڈوبی میری آواز نکلی۔

اس کے مکھ پر دکھ کی لکیر صاف تھی۔

''ہاں مجھے پھر آنا پڑا''

اس کی آواز سن کر میں نے آنکھیں بند کرلی اور سوچنے لگا۔ اب میں اسے یوں ہی بھٹکنے نہیں دوں گا۔ اس کا کام کرادوں گا جیسے بھی۔ مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔

وہ بیٹھی بیٹھی رونے لگی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اس نے مجھے چھوڑا نہیں ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں وہ مجھے چھوڑ دے۔ کائنات کی ہر خوبصورت چیز سے منہ موڑ کر میں نے اسے پیار کیا اور اب وہ میرے وجود سے بھی وہ نفرت کرنے لگا ہے۔ وہ چاہتا ہے میں اپنے میکے چلی جاؤں۔ مگر میں یوں ہی نہیں جانے والی۔ دنیا کے سامنے وہ سارے ناطے توڑ دے کر تب جاؤں گی۔ میں بہت دکھی ہوں۔

وہ سوچنے لگا پچھلی بار تو لڑکی ملازمت کے سلسلے میں پیروی کرانے آئی تھی۔ یہ نیا انکشاف کہ یہ شادی شدہ ہے۔

سن کر سکون ملا کہ یہ میرے کام آسکتی ہے۔ میں بھی تو اپنی بیوی کے سلوک سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے بھی تو ایک سہارا چاہئے۔

میں نے اس سے کہا کہ پہلے وہ اپنے میکے چلی جائے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔

اس نے میری بات ایک بزرگ کی رہنما کی ہدایت سمجھ کر مان لی۔ وہ مجھ سے برابر ملتی رہی۔ ۹۴/۲ ویکنسی کے تحت ٹیچر میں میں نے اس کی بحالی کرادی، اس نے اس وقت بی ایڈ کرلیا تھا۔

میں نے اسے ملازمت سے لگا دیا۔ وہ ہمیشہ مجھے مشکور نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وہ میری طرف دیکھتی تو میں بے تاب ہو جاتا۔ اس کے چہرے سے اب الجھن جاتی رہی۔ آسائش کی چمک آگئی تھی۔ اس کے شوہر نے اب دوسرا گھر بسالیا تھا۔

وہ میری احسان مند تھی۔ ہر وقت کوشش میں رہتی مجھے کوئی آرام دینے کی، خدمت کرنے کی۔ایک دن میری طبیعت خراب تھی۔ میں نے اسے بتایا میرے شریر میں شدید درد ہے۔وہ تڑپ اٹھی اور پھر سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

ماتھا دباتے ہوئے چہرے کو دونوں ہاتھ سے سہلاتی رہی۔ میں مدہوش سا آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔اسے لگا میں سو گیا ہوں اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو اپنے اوپر جھکا لیا۔آنکھیں کھول کر دیکھا۔اس کا چہرہ سرخ اور نم آنکھیں کچھ اصرار کر رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

تب وہ میری ہو کر رہ گئی۔وہ کسی سائے دار درخت کی طرح مجھ سے پیٹھ لگائے رہی۔

اوراب میں اسے طنز کے چھینٹے سے گھائل کرتا کہ وہ کہاں کہاں گئی کس کس سے ملی۔

جبکہ وہ مجھے سہارا دے کر میرے شکستہ خواب سے نجات دلاتی رہی۔

آسائش کا اجالا پھیل کر اس کی زندگی کے ہر لمحہ کو منور کرتا رہا اور میں اس کے جذبے کو کسی کے ساتھ بھی جوڑ کر گھائل کرتا رہا۔مجھ سے وفاداری جتانے میں اس کی سسکیاں بندھ جاتیں۔گھنٹوں وہ روتی سسکتی رہی تب کہیں جا کر میں اسے سینے سے لگا پاتا۔اب مجھے اس کے آنسوؤں میں لذت ملنے لگی۔وہ روتی، میں دیکھتا رہتا۔

ایک دن مجھے پتہ چلا وہ شادی کرنے والی ہے۔سن کر مجھے بہت ناگوار گذرا میں نے اسے بہت ڈانٹا کہ وہ احسان فراموش ہے۔اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ وہ کنارے کھڑی میری دہاڑ سنتی رہی اور اس شادی کی خبر سے لاعلمی ظاہر کرتی رہی کہ اس نے ایسا کچھ نہیں سوچا کہ تمھیں دھوکا دوں۔تم نے مجھے شفا دی ہے۔میں تمھیں دھوکہ کیسے دے سکتی ہوں۔مجھے بھی اب تمہارے قرب کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔مگر اب تم خود مجھ سے دور بھاگ رہے ہو۔جانے کس کی آنکھوں کی چمک تمھارے من میں تیر رہی ہے۔اورالزام مجھے دینے لگے ہو۔برسوں سے میں تمہارے اشارے پر ناچ رہی ہوں۔اور تم میرے احسان جتا جتا کر میری روح کو گھائل کر رہے ہو۔تم درندے ہو،محبت کرنا نہیں جانتے۔محبت کرنے والا کسی کی زندگی کو

آنسو سے نہیں بھر دیتا۔تم نے مجھے ہاتھ لگا کر ناپاک کیا ہے۔ مجھ سے بے جا حرکت کی ہے۔

میں نے اسے یا تمھیں پاک جذبے سے چاہا۔اور تم دونوں نے ہی مجھے دھوکہ دیا۔

ہماری پاک وصاف زندگی کو تم دونوں نے گناہ کی آلودگی سے ناپاک کیا ہے۔

تمہارے شک یا الزام سے پہلے کی طرح میں پاک نہیں ہو جاؤں گی۔ اگر تم نے مجھے مجبور کیا تو میں جان دے دوں گی۔ میری جوانی سے کھیلتے رہے اور دوسروں کو پاکیزگی کا درس دیتے رہے۔تم نے شک کی جس صلیب پر لٹکا دیا ہے۔وہاں سے اترنا مشکل ہے۔اب بہت ہو چکا۔ بہت ہو چکا کہتے ہوئے۔وہ روتے سکتے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سوچتا رہا۔اس بھکتن کے منہ میں زبان کہاں سے آ گئی۔

بے تحاشہ اس کی جانب دوڑنے کو من ہوا۔مگر سوچا ہمیشہ کی طرح وہ خود ہی مان جائے گی واپس لوٹ آئے گی۔مگر......

اس کی جدائی میں وہ کافی عرصہ تک پلنگ پر پڑا رہا۔''نرس میں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔''

ڈاکٹر کی صلاح سے وہ بھوالی بھیج دیا گیا تھا۔

روز بہ روز نرس بدلی جاتی رہی۔نئی نرس اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ وہ اس کے درد کو سنتی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اس نرس کا عادی ہو گیا۔بغیر اپنا درد سنائے اس سے رہا نہ جاتا۔ایک ہی بات کو کئی کئی بار سنا چکا تھا۔

''نرس میں اس کا گناہ گار ہوں۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ میں نے کیوں نہیں اسے اپنے گھر لوٹ جانے کو کہا۔ کیوں اپنی غرض کی خاطر اسے گمراہ کیا۔ میں اس گناہ میں جل رہا ہوں۔اب تو مجھے دکھائی بھی نہیں دیتا۔''

نرس نے دیکھا ایک ماہ سے چھ ماہ ہو گئے۔اس بوڑھے کی حالت لگاتار گرتی جا رہی ہے۔اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا ہے۔

وہ شخص دن رات پشیمانی کے آنسو بہاتا رہا۔نئی نرس دن میں دو سے چار گھنٹہ اس کے ساتھ گذارتی۔بقیہ وقت وہ اکیلے پڑا رہتا۔ یہاں نئی جگہ کوئی رشتہ دار بھی اس سے ملنے

نہیں آتے۔

ایک دن اس کے سینے کی ہلکی ٹیس اٹھ کر شدید تڑپ اختیار کر گئی اس کے ہاتھ پاؤں چھٹپٹانے لگے۔نرس بے چین ہو گئی۔

''نوین میں ہی تو ہوں تمہاری مینو میں نے ہی تو تمہیں یہاں بلایا ہے ڈاکٹر سے کہہ کر۔'' وہ بوڑھا سکتے میں آ گیا۔

اس کی چھٹپٹاہٹ تھم گئی۔

''کیا کہا تم نے۔تم میری مینو ہو۔تم کہاں چلی گئی تھی۔ بولو کہاں گئی تھی۔'' اس کے ہاتھوں کو نوین نے کس کر جکڑ لیا۔

''کہاں جاتی۔کہیں جانے لائق تھی ہی کہاں میں نے یہاں نرس کی نوکری کر لی۔ تمہیں دینے کا بہت مان تھا۔سو میں نے تمہارے دئے ہوئے مان کو لوٹا دیا۔چھوڑ کر چلی آئی تمہیں اور تمہاری دی ہوئی عنایتوں کو اور اب تک زندہ ہوں۔''

وہ بولے جا رہی تھی۔وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔مینو نے محسوس کیا۔اس کی مٹھیوں کی جکڑ ڈھیلی ہو کر ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

■■

اونکار

جوان بیٹیوں کے لیے کہاں سے 'ور' ڈھونڈ کر لائے۔

یہ سوال اسے ہر وقت پریشان کرتا رہتا۔ اونکار کی ماں اور بیوی جب تب اسے اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتی رہی۔ اس بات سے وہ بیزار ہو چکا تھا۔ اگر ور مل بھی گیا تو بیاہ کا خرچ کون اٹھائے گا۔

آخر کار ایک دن اونکار سلفاس کی ڈھیر ساری گولیاں نگل گیا۔

رکشہ کی کمائی سے سات سات بچوں کی پرورش، اس پر روز بہ روز نئی بیماریاں اور ڈاکٹروں کا چکر۔ کچھ وقت پہلے کا دور تھا جب دوائیاں سرکاری اسپتال سے مفت مل جایا کرتی تھیں۔ اب تو بغیر پرائیوٹ علاج کرائے بیماری جاتی ہی نہیں۔

ہڈیوں کا ڈھانچا بنا اونکار کہاں سے اتنی طاقت لائے کہ ماں اور بیوی کی تمنا پوری ہو سکے۔

''کاش اتنے بچے تو نہ جنتی تو آج ہم اپنے بھاگیہ کو کاہے روتے۔'' اونکار نے ایک دن بیوی سے کہا تھا۔

''بچوا جنے کا دوسی ہم ہی کھالی ہیں کا؟'' بیوی نے جواب دیا۔

اونکار نے آنکھیں موند لیں، پاؤچ کے اثر سے آنکھیں مدہوش ہو چکی تھیں۔

اس کشمکش کے باوجود بیوی اس بات سے مطمئن تھی کہ اس کے بچے جسمانی طور پر تندرست ہیں۔ وجنے کے بچوں کی طرح معذور اور اپاہج نہیں۔ دونوں پیروں سے اپاہج وجنے کا بیٹا مکیش جیون کے ابھیشاپ کو جھیل رہا ہے۔ اپنے باپ کی کرتوت اس کے جسم سے پھوٹ

پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ اس کی بہن رنکی بھی دماغی طور پر معذور ہے۔ دونوں ہی اپنے قریبی رشتہ داروں کی نظر عنایت کے محتاج ہیں۔ شراب کا موذی اثر اس کی کوکھ میں ہو چکا تھا۔

ماں تو بیماری کا شکار ہو کر موت کے گلے جا لگی۔ اور باپ، سستی اور گھٹیا شراب کو امرت بنا کر پیتا رہا۔ یہی امرت ایک دن زہر بن کر ان کے جسم میں پھیل گیا۔

اس طرح دو زندگی کو دھرتی کا بوجھ بنا کر وہ چل بسے۔

مائیکل اشوک گیتا چار بچوں کو چھوڑ کر شراب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ تین بیٹیاں اور ان سب سے چھوٹا ایک بیٹا۔

رات کو جب وہ گھر لوٹا تو اسے سینے میں جلن کے ساتھ ہی الٹیاں ہونے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی روح جسم سے باہر آ گئی۔

کوئی بھی مسئلہ جب سنگین شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کا حل قدرت خود پیش کرتی ہے یا انسان بھی اس کا حل تلاش کرتا ہے۔ قدرت زلزلہ اور دباؤ کی شکل میں اپنا حل پیش کرتی ہے۔ آبادی کا بے شمار بڑھنا بھی ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اس کا حل انسان کے ذریعہ بنائی گئی زہریلی شراب ہے۔ اس شراب میں تیز نشہ پیدا کرنے کے لیے جاوا، اسپرٹ، میوا، نوسادر، یوریا کا گھول، دھتورا اور مری ہوئی چھپکلی تک کو ملاتے ہیں۔

لیکن جسمانی محنت کرنے والے دن بھر کی محنت کے بعد رات میں کچھ ایسا چاہتے ہیں جو ان کی تھکان اور فکر دور کر کے دوسری دنیا میں لے جائے۔

کم آمدنی اور زیادہ خرچ۔ آگے کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری راستے بند۔

چودہ برس کے اونکار کو پہلی بار شراب کا مزہ تب چکھنا پڑا جب وہ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر راجدھانی پٹنہ میں رکشہ چلانے آیا تھا۔

اس نے سن رکھا تھا وزیر اعلیٰ نے رین بسیرا بنوایا ہے۔ اب تمام رکشہ والے پکی چھت کے نیچے رات گزار سکیں گے۔ لہٰذا وہ شہر میں آ گیا۔

جب پہلی بار مکیش کا کا نے بھیڑ بھرے برآمدے میں بستر لگایا تو اسے بڑی گھٹن محسوس ہوئی۔ ہر شخص اپنی ایک کروٹ بھر جگہ رکھ کر دوسرے شخص کو جگہ دے رہا تھا۔ ایک دوسرے کے میلے کچیلے کپڑوں کی بدبو بے چین کرنے لگی۔ سرہانے بچی جگہ میں سب کے برتن باسن اور کپڑے رکھے ہوتے۔

ابھی اس کی داڑھی اور مونچھیں بھی نہیں آئی تھیں۔ لیکن گھر کی پریشانی کے سبب اسے گاؤں سے باہر آنا پڑا تھا۔ کھیتی کے وقت تھوڑا کام ملتا تھا باقی وقت خالی۔

مکیش کا کا نے ہفتہ بھر میں اسے رکشہ چلانا سکھا دیا تھا۔

اب وہ راجدھانی کی سڑکوں، سنکری گلیوں میں آزادانہ سیر کر رہا تھا۔ اسے خوب مزا آتا تھا۔ سواری کے بہانے پورے شہر کا چکر لگانے میں۔

رات میں ایک بار اسے بڑی تھکان محسوس ہوئی۔ جسم تھکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ جبکہ آج سے قبل کھا پی کر منھ ڈھاپ کر وہ سو رہتا تھا۔ اسے خبر نہیں ہوتی کہ رین بسیرا کے باقی لوگ کتنی رات تک ہنسی ٹھٹھولے کر رہے تھے یا کہ اپنے اپنے آخری گھونٹ نگل رہے ہیں۔ لیکن اس رات اس نے وہ تمام چیزیں دیکھیں۔

ایک منچلے نوجوان نے اس کی تکلیف دیکھ کر کہا۔

"ایک گھونٹ بھر لے تمام تھکان دور ہو جائے گی۔"

"نہیں میں اسے ہاتھ نہیں لگاتا۔" اونکار نے مخالفت کی۔

"ہاتھ لگانے کو کون کہہ رہا ہے منھ لگانے کی بات کر رہا ہوں۔" دوسرے شخص نے کہا۔

رات اپنے پروان پر تھی۔ جو لوگ پاؤچ گٹک چکے تھے انہیں اپنی اصلی حالت کی خبر نہیں تھی۔

ایک تیسرے شخص نے اس کے ہونٹ سے گلاس لگا دیا اور گردن اوپر کر دی۔ گلاس ہونٹ سے لگتے ہی منھ گھونٹ سے بھر گیا۔ چار ناچار اسے نگلنا پڑا۔

کئی گھونٹ پی گیا تب اس شخص نے اسے چھوڑ دیا۔

اسے نہ الٹی ہوئی نہ چکر آیا۔ زمین سے پیٹھ لگتے ہی نیند آگئی۔

صبح اٹھا تو من میں ایک نئی امنگ اور جوش تھا شراب کو وہ ہضم کر گیا تھا۔ اسے ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس کے نقصان کے بارے میں سوچے۔ لہٰذا اگلے دن بھی پاؤچ کو منھ سے لگالیا۔

گاؤں میں ماں باپ بھائی بہنوں کے دل میں ارمانوں کی باڑھ آگئی۔ ابھی سال بھر بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ کماؤ بیٹے کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔

اس کے بعد دادا دادی بننے کی روایتی چاہت نے اونکار کی زندگی میں جدوجہد کے تمام راستوں کو کھول دیا۔ اس نے بڑی معصومیت سے تمام خواہشات کو پورا کیا۔

بچپن سے ہی یہی دیکھا تھا کہ گاؤں کے لڑکے تھوڑا بڑے ہوئے اور ان کا روزگار لگا۔ چاہے کھیتی باڑی یا مزدوری، رکشہ چلانا یا کل کارخانوں میں کام کرنا پھر پریوار بسا کر گاؤں گھر میں خرچ بھیجنا یہی زندگی تھی۔

بچپن سے ہی یہی دیکھا تھا، گاؤں کے لڑکے تھوڑا بڑے ہوئے اور ان کی زندگی برائیوں کا بھنڈار بن گئی۔ اسے خوبصورت کیسے بنایا جائے۔ شاید اسے خوبصورت نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کی چار بیٹیاں ہیں۔ ان کا کھانا کپڑا تو وہ برسوں سے پورا کر رہا ہے۔ لیکن بیاہ کا بوجھ خوفناک سایہ بن کر اسے ہر لمحہ خوفزدہ کر رہا تھا۔

ان باتوں سے تنگ آکر اونکار نے سلفاس کی گولیاں کھالیں۔ ان کے گھر کی عورتیں ایک مجرم کی طرح پولس والوں کے سامنے کھڑی ہیں۔

گاؤں کی ایک عورت نے آگے بڑھ کر پولس والے سے کہا—

''کاش کسی کے پاس ایسی اسکیم ہو کہ غریب کی بیٹیاں بھی عزت سے اٹھ سکیں۔''

■■

تیتری

''پاپا، پاپا تم نے مجھے روکا کیوں نہیں پاپا مجھے روک لیتے۔''

نغمہ چلا چلا کر رو رہی تھی کہ پاپا نے سسرال جانے سے روک کیوں نہ لیا۔

ٹھیک دو دن پہلے نغمہ اپنے میاں کے ساتھ سسرال گئی تھی۔ کرن کے پاؤں پر جلتا ہوا چاول کا مانڑ گر گیا تھا اور وہ بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ اس کے پاپا بستر پر بیمار پڑے تھے اس لیے داماد کے ساتھ اسے بلا لیا تھا کہ وہ یہاں آجائے تو میں دیکھ لوں۔ داماد اسے ساتھ لے کر آیا تو ضرور۔ لیکن مہینہ پندرہ دن کے لیے چھوڑنے کو راضی نہیں ہوا۔

صرف دو دن رہا اور زخمی پیر لیے ہوئے جانے کو تیار۔

صبح صبح اٹھ کر تیار ہوا اور نغمہ سے دھیرے سے کہا کہ میرے ساتھ چلو ورنہ میرا مرا ہوا منھ دیکھو گی۔ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ پاپا دالان میں بیٹھے دیکھتے رہے۔ بیماری کی تکلیف سے وہ بول نہیں پا رہے تھے۔ صرف دیکھ رہے تھے کہ بیٹی جانے کے لیے سامان تیار کر رہی ہے۔

''نہیں رکو گی نغمہ۔'' پاپا نے دھیرے سے پوچھا۔

''نہیں پاپا انہوں نے ایسی بات بول دی ہے کہ ہمیں جانا ہی پڑے گا۔ آخر زندگی تو انہیں کے ساتھ گزارنی ہے۔''

بیٹی کی ایسی سمجھ داری والی بات سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے بسی کے آنسو۔

اپنی تیتری بیٹی کو وہ روک نہیں پائے اپنی نظروں کے سامنے نہیں رکھ پائے اس نازک آخری وقت میں۔

تیسرے دن اس کے پاپا گھر سے نکلے ڈاکٹر کو دکھانے۔ بجلی آفس میں حاضری دے کر وہ شہر جانے والے تھے۔ بس اسٹینڈ تک پہنچے ہی تھے کہ طبیعت بگڑی اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ چائے والی سے کہا کہ ''ملکینی تنی پانی پیاوا۔'' وہ پانی لینے کو مڑی۔ پانی لے کر واپس لوٹی تو وہ ایک طرف لڑھک چکے تھے۔

نغمہ کو پاپا کا مرا منھ دیکھنے لکھنؤ سے آنا پڑا۔

لیکن بدقسمتی سے مرا منھ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی تدفین ہو چکی تھی۔

مجھے نغمہ کی پیدائش یاد ہے۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کے پاپا نے خوب خوشیاں منائی تھیں۔ تین بیٹوں پر ایک بیٹی ہوئی تھی تیتری نام رکھا۔ نین نقش بے حد خوبصورت مگر رنگ باپ کو سانولا سلونا پڑا تھا۔ ماں خوش ہو کر کہتیں جو بیٹی باپ پر پڑتی ہے وہ خوش نصیب ہوتی ہے۔

نغمہ ابھی تیرہ برس کی ہوئی ہوگی کہ باپ کو بیٹی کے بیاہ کا شوق چرایا۔ ماں کا بھی مذہبی خیال تھا کہ جیوں ہی بیٹی سیانی ہو فوراً بیاہ کرنا چاہیۓ۔ ورنہ ہر مہینہ ایک روح آکر چلی جاتی ہے۔ اس لیے گناہ پڑتا ہے۔

نغمہ کی ساس اپنے اکلوتے اور سرپھرے بیٹے پر جس قدر ناز کر سکتی تھیں کر رہی تھیں، لڑکا سمپل بی اے پاس اور بے روزگار۔ باپ کی بنائی پراپرٹی سب اسی کی تو ہے۔ کہہ کر شادی طے ہوگئی۔

لڑکا بھی نغمہ پر اس قدر فدا ہوا کہ شادی کے بعد ایک دن بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ کمسن لڑکی ماں کے گلے لگ کر پھر پھر کر روئی کہ امی تم نے کیوں نہیں بتایا کہ شادی کے بعد یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کچھ بتایا بھی نہیں اور مجھے بھیج دیا دولھے کے پاس۔ اچھا نہیں کیا امی تم نے۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

لوگوں کو شراب، سگریٹ وغیرہ کی لت لگتی ہے، لیکن اس لڑکے کو نغمہ کی لت لگ گئی تھی۔ پاپا کے مرنے میں بھی آیا تو الگ کمرہ مانگ رہا تھا۔ لوگوں کے ڈانٹنے اور شرم دلانے پر کچھ دیر

خاموش رہا۔

اب ادھر ڈیڑھ برس کی لڑکی اس کے پاس ہے۔ جب بچی پیدا ہوئی اور اسے تقریباً دو ماہ الگ رہنا پڑا تو اس نے سوچ لیا تھا کہ اب بچہ نہیں پیدا کرنا ہے۔ نہ بچہ پیدا کریں گے نہ اتنے دن بیوی سے الگ رہنا پڑے گا۔

لہٰذا بیوی کو گولیاں کھلانے کی عادت ڈال دی۔ اتنی دوائیاں کھلائیں کہ اسے بیماری لگ گئی۔

پہلے تو کچھ دنوں گپ چپ باتیں رہیں کہ وہ بیمار ہے بیمار۔ ڈاکٹر نے میاں سے الگ رہنے کی صلاح دی۔ جب پہلی بار نغمہ کی امی ڈاکٹر کے پاس اسے لے کر گئیں تو داماد بھی ساتھ تھا۔

داماد نے ساس کی موجودگی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب جب بھی ہم دونوں ساتھ ہوتے ہیں یہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔'' داماد کی اس بے ہودگی پر ساس بہت ناراض ہوئیں۔

جسم کا ہر عضو سوکھ کر کنکال ہو گیا۔ کہیں کہیں سے زخم رسنے لگا۔ ڈاکٹروں نے حتی کہ کینسر کا شبہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد نغمہ چلنے پھرنے سے قاصر ہو گئی۔ باتھ روم کے لیے بٹھایا جاتا تو اٹھ کر خود سے کھڑی نہیں ہو پاتی۔ رشتہ دار اس بات سے ناواقف تھے کہ اصل مرض کیا ہے۔

ماں سب سے کہتی رہیں کہ مرض پکڑ میں آگیا ہے۔ جلد ہی لڑکی ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن داماد سے انہیں اب نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اس نے اس کا یہ حشر کیا ہے۔ میری پھول سی بچی کو مسل ڈالا۔

شروع کے دنوں میں داماد کی خوب خاطر ہوئی۔ جس کے سبب تندرستی دن دونی بڑھتی گئی۔ لیکن لڑکی جیوں کی تیوں نرم و نازک بنی رہی۔

پانچ برس کی شادی شدہ زندگی نے اسے بستر مرگ پر پہنچا دیا۔

جب نغمہ کی چھوٹی انٹی نے اپنی بیٹی منی کی شادی کی چرچا شروع کی تو نغمہ سن کر بے چین ہو گئی۔

انٹی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور جب انٹی آئیں تو ان سے رو رو کر کہا۔

''نہیں انٹی یہ آپ کیا کر رہی ہیں اتنی کم عمر میں شادی مت کیجئے گا انٹی۔ ورنہ میرا حشر دیکھ رہی ہیں۔ اب میں کسی لائق نہیں ہوں میں جانتی ہوں انٹی۔ میں نہیں بچوں گی۔ مجھ کو کینسر ہو گیا ہے۔ میرے میاں کو دیکھ کر آپ لوگ خوش ہوتی تھیں نا کہ بہت مانتے ہیں۔ مانتے نہیں ہیں انٹی ان کو ہمارے جسم سے محبت ہے ہماری زندگی سے نہیں۔ اچھا ہوا مجھے یہ بیماری لگ گئی۔ اسی بہانے میں اس بے معنی کی شادی شدہ زندگی سے تو نکل پاؤں گی۔''

''چپ رہو نغمہ۔ زیادہ مت بولو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب جو بھی ہو جتنی بڑی لڑائی لڑنی پڑے تمہارے خالو سے۔ مگر منی کی شادی کم عمر میں نہیں کروں گی۔''

چھوٹی انٹی نے اسے تسلی دی تو نغمہ نے سکون کی سانس لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

اس کی ننھی بیٹی پلنگ کے آس پاس اب بھی کھیل رہی تھی، چہک رہی تھی۔

■■

حشر کے دن

اچھے لوگوں کا ساتھ اچھا اثر ڈالتا ہے۔ ایسا بہت بار سن چکی تھی۔
شاید اس کی خوش قسمتی کا چھوت مجھے بھی لگ جائے اور میری بھی زندگی سنور جائے۔
شازینہ نے سوچا تھا کتنے مزے کی زندگی تھی۔ اس کی سرکاری نوکری مکان وغیرہ سب کچھ تو تھا۔

کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ گنی چنی دو چار باتیں ہوتیں۔ جب چلنے کو اٹھتی۔
''کہاں جارہی ہو، بیٹھو۔'' کہہ کر وہ روک لیتا۔

جب بھی کہیں جانا ہوتا۔ وہ کہتی فلاں کام سے جانا ہے چلیں گے۔ 'چلو' مختصر سا جواب دے کر تیار ہونے لگتا اور تیار ہو کر اس کے ساتھ چل پڑتا۔ بالکل خاموش۔ بلکہ وہ ہی ٹوکا ٹوکی کرتی۔

اس کا سارا حسن اس کی خاموشی میں پوشیدہ تھا۔ وہ سوچتی کتنا فرمانبردار دوست ہے۔
کاش زندگی یوں ہی چلتی رہے۔ نہ اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی آئے اور نہ میری۔
اس کے پہنچنے پر اسے خوشی ہوتی تھی۔ وہ چہرے سے جھلکتی تھی۔ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا سواگت تو کرتا، مگر خوشی کے کسی کلمات سے نہ نوازتا۔ وہ سوچتی وہ خوش ہوا بھی یا نہیں۔
شاید مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ جاتی وہ مسہری پر ٹیک لگائے ٹی وی کی طرف مسلسل دیکھتا رہتا۔ کافی لمبی خاموشی سے شازینہ کو کوفت ہونے لگتی۔

تقریباً آدھ گھنٹے یوں ہی سانس روکے بیٹھی رہتی۔ اتنا لمبا راستہ طے کر کے چوتھی منزل تک کی سیڑھیاں چڑھ کر آنے سے اسے پیاس لگ جاتی۔ پانی پئے بھی تو کیسے۔ وہ کچھ

بولے تب تو اس سے پانی مانگے۔

وہ یہی سوچتی رہتی کہ کانوں میں آواز گونجتی۔

''تب کیا حال ہے سب ٹھیک ہے؟''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر صرف اتنا کہہ پاتی 'ہاں' اتنا پوچھنے پر ہمت جٹا پائی کہ'' فلاں کام سے جانا ہے چلئے گا۔''

'چل چلوں گا۔'

پھر وہ اٹھ کر کچن میں جاتا۔ چائے بنا کر لاتا اور وہ دونوں چائے پیتے۔ اس دوران بھی مسلسل خاموشی۔ اس نے ہی ایک بار پوچھ لیا کہ'' میرے آنے سے تکلیف ہوتی ہے؟''

''نہ آنے سے ہوتی ہے۔'' سن کر من خوشی سے جھوم اٹھا۔ چائے کے بعد وہ تیار ہوتا اور پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل پڑتے۔

کبھی وِسکومان بھون، کبھی وومنس ٹرینگ کالج، کبھی دربھنگہ ہاؤس، کبھی روزگار آفس، تو کبھی پٹنہ مارکیٹ۔ گھر پر رہتے ہوئے کبھی بھی کہیں جانے کا پروگرام بناتی تو شازینہ کے ذہن میں فوراً اس کا خیال آجاتا اور نظروں کے سامنے اس کا خاموش چہرہ گھوم جاتا۔ اس سے ملنے کے بعد کہیں بھی اس کے بغیر جانے کا تصور نہ کیا۔ اس کے ساتھ خوب گھومی۔ پٹنہ کی سڑکوں پر۔ اس کے دوستوں نے اور شازینہ کے گھر کے لوگوں نے ہم کو بدنام ہونے کا احساس کرایا۔ مگر ان دونوں کی نیت صاف تھی۔ ان دونوں نے توجہ نہ دی۔

ایک بار فون اس کے دفتر میں میں نے پوچھا کہ کہاں ہیں وہ۔ جواب میں ایک سوال تھا۔'' تم لوگ شادی کب کر رہے ہو۔'' وہ گھبرا گئی۔

شادی تک تو بات پہنچی ہی نہیں۔

''اس طرح گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ خوب آئس کریم کھائی جا رہی ہے۔''

ایسی باتیں لوگوں کے بیچ پھیلنے لگی تھیں۔ اس بات کا اندازہ ہو جانے پر ان دونوں نے ساتھ پھر کبھی آئس کریم نہیں کھائی۔

اس سے بھی کبھی کسی نے پوچھا تو کہتا کہ غلط سلط بات مت کرو۔

ایک بار ارشاد بھائی نے شازینہ کے سامنے اس سے پوچھ لیا۔
''تم ان کو پسند کرتے ہو ہمیشہ کے لیے یا یوں ہی ساتھ گھومتے پھرتے ہو۔''
جھٹ اس نے جواب دیا۔
''تب کیا دو دن کے لیے پسند کیا ہے۔''
اس کے اس جواب سے میں اس قدر خوش ہوئی کہ خیالوں میں ہی بہت قریب ہو گئی دل سے، جان سے، ایمان سے۔
اس نے خدا کا نام اتنی بار اپنے دل میں نہیں دہرایا جتنا اس کا۔ اس کے رویں رویں میں، سانسوں میں، اس کی دھڑکن کی رفتار میں، اس کا نام اس کا خیال رواں دواں تھا۔

میں نے ایک بار ان سے کہا کہ ''گھر جا رہے ہیں تو بات کر کے آئے گا۔ اب انتظار نہیں ہوتا۔''
''ضرور بات کر کے آؤں گا۔''

تم نے کہا تھا۔ کاش تم اس بات پر قائم رہتے۔
جواب میں تم نے اپنی شادی کی تاریخ رکھ دئے جانے کی خبر سنائی اور ساتھ ہی ایک خط تھمایا۔ جس میں تم نے لکھا تھا اپنا گھر بسا لینا۔
یہ سن کر پیروں تلے زمین کھسک گئی۔
میں بساؤں نہ بساؤں اس کی فکر کرنے والے یا مشورہ دینے والے تم کون ہوتے ہو۔
''تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں۔'' میں کیا کروں۔
''اس کا کیا ہوگا۔''
''تمہیں اس کی فکر ہے میری نہیں۔''
''تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے میری یاد نہیں آئے گی؟'' شازینہ نے پوچھا تھا۔
''محبت ہے بہت ہے۔ تمہاری یاد بہت آئے گی۔ لیکن مجبور ہوں۔ تم مجھے کس پر چھوڑ

کر جا رہے ہو۔ جیسے کوئی دنیا سے ہی جا رہا ہو۔ اکیلا چھوڑ کر۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

کتنا بڑا دل ہے تمہارا۔ تمہارا دیا ہوا کارڈ زندگی کی ہر خوشی اور غم سے بھاری پڑ رہا ہے۔ اتنا قیمتی تحفہ تو زندگی بھر سنبھال کر رکھوں گی۔ میں گھر بس جانے سے بہت خوش ہوں۔ مگر اپنا کیا ہوگا سوچ کر دکھی ہوں۔ تم نے کارڈ تھمایا اور خوشی بجھ گئی کہ میں اس میں کہیں نہیں ہوں۔

خود کو سمجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔

اور اب جب میں زندگی سے فرصت پانے کی تیاری میں ہوں تو تم شادی کی تیاری میں مصروف ہو۔ جب میری روح فنا ہو رہی ہو گی اور تم بارات لے کر جا چکے ہو گے اور میں تمہیں دیکھنے کی حسرت لیے بمشکل دم توڑ رہی ہوں گی۔ تمہارا نکاح پڑھایا جا رہا ہوگا اور میرے لیے سورہ یٰسین پڑھی جا رہی ہوگی۔ نکاح کے بعد جب لوگ ایک دوسرے کو نکاح کی مبارکباد دے رہے ہوں گے۔ اس وقت لوگ میری موت کی خبر ایک دوسرے کو پہنچا رہے ہوں گے۔ جب وہاں دعوت کا کھانا کھلایا جا رہا ہوگا۔ تب ہمارے گھر کے لوگ دوسروں کے گھروں کا پکا ہوا کھانا کھا رہے ہوں گے۔ کیوں کہ جس گھر میں موت ہو جاتی ہے اس گھر کا پکا ہوا کھانا اس دن نہیں کھایا جاتا ہے۔

تم اس کی مانگ میں سیندور بھر رہے ہوگے میرے بالوں میں عورتیں گیلی مٹی دے رہی ہوں گی۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں مانگ بھری جاتی ہے۔ نہلانے سے پہلے مٹی کا لیپ دیا جاتا ہے۔

جب تم دلہن کو رخصت کرا کر لا رہے ہوگے۔ تب میرا جنازہ گھر سے باہر نکل رہا ہوگا۔

جس وقت تم دلہن کو لے کر گھر میں داخل ہو رہے ہوگے تب مجھے قبر میں داخل کیا جائے گا۔ تم دلہن کے ساتھ کمرے میں بند ہوگے۔ میری قبر کو بند کر دیا جائے گا۔

جب تم دلہن سے گفتگو کر رہے ہوگے جب تم دونوں کے بیچ بات چیت چل رہی ہوگی۔ اس وقت فرشتے قبر میں مجھ سے بات چیت اور پوچھ تاچھ کر رہے ہوں گے۔

میرے تیجہ کے دن تمہارے گھر ولیمہ ہوگا۔ میرے دسویں کے دن تم سسرال میں دسہرا

کھا رہے ہو گے۔

تم اپنی مصروفیت کے سبب میرے کسی بھی کام میں شریک نہ ہو سکو گے۔ اس لیے میں نے تمہیں آخری ملاقات کے لیے بلایا ہے۔

جسے تم چپکے سے ٹال گئے۔

حتّٰی کہ میری برسی منائی جائے گی اور تم میرج ڈے مناؤ گے ہر سال یہ سب ہو گا۔

میں عرش سے تمہیں دیکھ رہی ہوں گی اور تم دلہن کو فرش کی جنت کی سیر کرا رہے ہو گے۔

حشر کے دن مجھے انتظار ہو گا۔ جب تم دنیا کی ساری خوشیاں سمیٹ کر ان سے لطف اندوز ہو کر آؤ گے۔ تب میں تمہاری دامن گیر ہوؤں گی۔

■■

بھائی بہن

''کہیئے! کیا بات ہے؟''

آواز اور چہرے کے آثار میں اجنبیت تھی۔ یادداشت میں دو سال پرانی بات جاگ اٹھی۔ میرے پاس آنے کے لیے تمہیں پوچھنا پڑے گا۔ پوچھا مت کرو۔ چلی آیا کرو۔ جب چاہو۔''

انہیں الفاظ کے سہارے میں تم تک چلی آئی۔ لیکن اسے صرف اپنا عہدہ یاد رہا۔ اور مجھے اس کے الفاظ۔ الٹے پاؤں واپس آگئی۔

ایسا بھی ہوتا ہے۔؟ دل نے جواب دیا، 'ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اسے چھوڑ دینے کی خواہش شدید ہوتی چلی گئی۔

واہ رے میرے بھیا! تو اتنا آگے بڑھ گیا ہے اور اتنا بڑا کہ اپنی بڑی بہن کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہوا۔ تجھے میرا آنا ناگوار گزرنے لگا۔ مجھے دیکھ کر خوشی کا شائبہ بھی نظر نہیں آیا۔

تمہاری بیوی اور بچے بھی پوچھتے ہیں،

''پاپا سے کوئی کام ہے کس کام سے آئی ہو پھوپھی؟''

''نہیں بیٹا! تم لوگوں کو دیکھنے آئی ہوں۔''

بچے اس جواب کو سن کر بادل ناخواستہ اٹھتے ہیں اور ممی سے جا کر چائے کے لیے کہتے ہیں۔ ماں آداب سلام کرکے بغیر کچھ اور پوچھے کچن میں چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر پھوپھی کا دل کڑھنے لگتا ہے۔

اس گھر کا ایک ایک ذرہ جو کبھی ان سے آشنا تھا۔ اس وقت در و دیوار اجنبی لگنے

لگتی ہے۔تھوڑی دیر رکنا بھی گراں گزرنے لگا۔انہیں لگتا کہ وہ ان سب کا وقت برباد کرنے آگئی ہیں۔

اور بھائی! وہ تو سماجی کارکن ہے، سیاسی آدمی ہے۔وہ سماج سے ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے اسے بھی اپنے مقام کا احساس ہوگیا ہے۔اسی وجہ سے تو انہیں نوکروں سے کئی مرتبہ کہلوانا پڑتا ہے کہ اگر وہ فرصت میں ہوتو اس سے ذرا مل لوں۔دیکھ لوں اپنے بھیا کو۔اس بھائی کو جسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔جس کی پرورش ماں بن کر کی۔جس کی بیماری میں کئی راتیں جاگ کر گزاریں۔جسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی، کپڑے پہناتی، کاجل پاؤڈر لگاتی۔پڑھنے بھیجتی۔اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے روشن مستقبل کے لیے دعائیں کرتیں۔

چھ ماہ کا تھا۔تبھی ماں کو خطرناک بیماری نے جکڑ لیا۔تب سے وہ بڑی بہن کی گود میں پلا۔پڑھائی لکھائی کی شروعات بھی بہن نے کرائی۔

بہن کو ان ساری باتوں کا شرف لینے کی قطعی خواہش نہیں لیکن بھائی کے ذریعہ نظر انداز کئے جانے کو اپنی توہین سمجھنے لگیں۔آٹھ سال کا تھا تو ماں چل بسی۔

بہن کے لیے بھائی ہی غم بھلانے کا سہارا بن گیا۔اس کی پڑھائی اور دیکھ بھال کی فکر ہی زندگی کا مقصد بن گئی۔

اب وہ اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ برائی کی ساری تعریفیں اس کے آگے جھکتی ہیں۔سماج کو برائیوں سے پاک کرنا اس کا نصب العین بن گیا ہے۔لیکن اپنوں سے وہ دور ہوگیا۔

وہ شاہدہ سے پیار کرتا ہے یہ بات جب بالکل واضح ہوگئی تو بہن نے شادی کی اجازت دے دی تھی۔ساری باتیں بہن کے ذہن میں یادوں کی وادیوں سے یکے بعد دیگرے گزرتی گئیں۔

اب اس سے ملنے نہیں جانا ہے۔

اس عزم کو مستحکم کر کے وہ اپنے شوہر کو رات کا کھانا کھلانے میں لگ گئی۔

خود کو سنبھالا۔مجھے کسی چیز کی کمی ہے کیا جو میں اس کے پاس جاؤں۔شوہر یونیورسٹی میں پروفیسر۔بیٹا بی ایس ایف میں افسر۔ایک بیٹی وہ بھی شادی شدہ۔میں کیوں اس کی فکر میں

ڈوبی رہوں؟ بہت کر چکی اس کی فکر۔ اس کی فکر میں اپنی قبر بھی تیار کرلوں تو کیا وہ اسے سمجھے گا؟

اتنا غصہ ان کو پہلے کبھی نہیں آیا۔

لیٹنے کے بعد بھی ان کے دماغ میں بھائی کے برے سلوک کا نقشہ گردش کرتا رہا۔ دل رو رہا تھا۔ نہ جانے کیسی کشش تھی کہ اس کی طرف سے ذہن ہٹانے کے فیصلے کے باوجود بار بار اسی کی طرف چلا جاتا۔ ہر بار لگتا جیسے وہ کچھ کر بیٹھے گی۔

تبھی آدھی رات کو بھائی کی نگاہیں تلاشتی ہوئی آگئیں۔ نظر پڑتے ہی اس کے دل نے کہا۔ '' آج تم نے مجھے بچالیا۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھتی۔''

کچھ اپنے ساتھ کر گزرنے کی تمنا غصے کے ابال کے ساتھ اور مضبوط ہو رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے میں ان ساری چیزوں کو تباہ کر دینا چاہتی تھی جو ہمارے رشتے میں رکاوٹ بن رہی تھیں اور جو تمھیں مجھ سے زیادہ عزیز تھیں۔

لیکن میں تمہاری عظمت کی داد دیتی ہوں کہ تم نے تعطل کا شکار ہوتے ہوئے بھی میرے بازوؤں کو، بے چین ہوتے دل کو سنبھال لیا۔ اپنی صرف ایک آمد سے ۔ وہ خاموش رہیں۔ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

'' اگر تم ناراض ہو جاؤ گی تو میرا سب کچھ ختم ہو جائے گا آپا۔''

بھائی کے مایوس کن لیکن اپنائیت سے بھرے الفاظ نے بہن کی آنکھوں کو خوشیوں کے آنسوؤں سے بھر دیا۔

■■

جسے بھول نہ پائی

دربھنگہ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک کسی آواز پر میرے قدم رک گئے۔ پلٹ کر دیکھتی ہوں۔ ایک عورت بے بسی کے عالم میں اوٹے پر بیٹھی ہے۔ اس کی نظر مجھ سے ٹکرائی تو اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

میں اس کے پاس گئی تو اس نے کہا— ''دیدی ہم جات رہلیں گنگا جی میں آتم ہتیا کرے، بکی ہمار ہمت نہ پڑل، ہم کے اپنے گھرے لے چلو۔''

اچانک میں اسے کوئی جوب نہیں دے سکی۔ پہلے میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کڑاکے کی سردی میں، اس کے بدن پر کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی، گوری چٹی، گول مٹول بدن۔ مگر بالکل دیہاتی الہڑ۔ زرد ساڑی اور سرخ بلاؤز پہنے ہوئے۔ آنچل سے اپنی بانہوں کو ڈھکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

میں اسے دیکھ رہی تھی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے کو کہا۔ اس دوران اس کی بانہیں کھل گئیں۔ جو بری طرح جلی ہوئی تھیں۔ جس پر اس نے پاؤڈر چھڑک رکھا تھا۔

''کیسے جل گیا؟'' بانہیں دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''ہمار ساسو جی چاہ کا پیالا پھینک دہلیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے شوہر کہاں رہتے ہیں؟''

''او باہر رہے لاں۔ جوتا کے کارکھانہ میں کاریگر ہو واں۔''

سردیوں میں کلاس مارننگ ہو گیا تھا۔ ایم اے آخری سال کی پڑھائی تھی۔ اس لیے کلاس چھوڑنا اپنا نقصان کرنا تھا۔ ان دنوں ساڑھے سات بجے تک ہم سب یونی ورسٹی پہنچ

جاتے۔

اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے دیر ہونے لگی تھی۔ پھر بھی اس کے بارے میں جاننے کی خواہش کے سبب میں کچھ دیر اور اس کے پاس رہی۔ اس نے مجھ سے میرے گھر چلنے کی بات دہرائی تو میرا ذہن اپنے کرائے کے مکان کی ایک چھوٹی سی کوٹھری کی جانب گیا۔ جس میں کسی کو ساتھ رکھنا تقریباً ناممکن تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اپنے گھر سے کیوں چلی آئی؟ وہیں چلی جاؤ۔''

''اب اونہاں نا جائب۔'' اس نے جواب دیا۔ مزید بولتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہمرا کے بڑا ستاوے لاں...... پاہن (مہمان) بھی ہمرا پے ہاتھ اٹھاوے لاں۔ چار برس سے بیسی ہو گئیل بیاہ کے، بکی ہمکے بچہ نا بھئیل۔ اہی کھاتر ہمرا سے نا کھس رہے لیں۔''

''تب بھی تمہیں وہاں سے نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہیں چلی جاؤ۔ نہیں تو اپنے میکے چلی جاؤ۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''ہم آپن گاؤں نا دیکھلے ہئیں۔ موگل سرائے سے چار کوس آگے با۔ ہمرا مائی اور بابوجی مو و گیلین۔ ہمر بیاہ گاؤں کے چاچا جی کیلن۔ اونہاں سے بھی اب کیہو نا آوے لا۔ ہم کے آپن گھر لے چلبو دیدی؟''

میں نے چاہا اسے شال اتار کر دے دوں۔ اس ٹھنڈک میں ننگے پاؤں زمین پر بیٹھی تھی۔ مگر چاہ کر بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اب اگر دے سکتی تو۔ کیوں کہ بڑی مشکل سے ٹیوشن کے پیسہ اکٹھا کر کے میں نے خریدی تھی۔ اگر دے دیتی تو گھر پر کیا جواب دیتی اور یونی ورسٹی اوڑھ کر کیا جاتی۔ من ہوا سوئیٹر ہی اتار کر دے دوں۔ دوسرے ہی لمحہ میں اسے سوئیٹر اتار کر دینے لگی تو اس نے منع کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بانہیں جلی ہوئی تھیں اور وہ کافی صحت مند تھی۔ جسے میرا سوئیٹر چھوٹا ہو جاتا۔ میں اسے سے وہیں بیٹھے رہنے کو کہہ کر کلاس کرنے چلی گئی۔ کلاس میں میری طبیعت بالکل نہیں لگی۔ میرے ذہن میں بس ایک بات گردش کر رہی تھی کہ وہ عورت گنگا میں کودنے آئی تھی۔ اگر وہ صحیح معنوں میں کود جاتی تو۔

خدا خدا کر کے پینتالیس منٹ کا کلاس ختم ہوا اور میں باہر آئی۔ میں تیزی سے اس

عورت کے پاس پہنچی جہاں اسے چھوڑ کر گئی تھی دیکھتی ہوں کہ وہ غائب۔ مجھ پر سناٹا چھا گیا۔ اس عورت کے بارے میں مختلف خیالات پیدا ہونے لگے۔ کہاں چلی گئی۔ میں نے اسے رکنے کو کہا تھا۔ شاید اس نے میری بات سمجھی ہی نہیں یا کوئی اور بات پتہ نہیں، اس کے ساتھ کیا ہوا وغیرہ وغیرہ۔

سارا دن وہ میرے ذہن پر چھائی رہی۔ جہاں تک میرے ذہن کی بات ہے اس کی یہ کمزوری رہی ہے کہ اس میں جو کچھ داخل ہو جاتا ہے وہ نکلتا نہیں۔ چاہے کوئی شخص ہو، کوئی واقعہ ہو۔ جس سے بہت خوشی ملی ہو وہ بھی، جس نے بہت غم دیا ہو وہ بھی۔ اس نہ نکل پانے نے ہمیشہ ہی مجھے ذہنی کرب میں مبتلا رکھا ہے۔

آج کئی ماہ گزر گئے، سال لگ گئے۔ اس عورت سے ملے ہوئے۔ لیکن اس کی یاد دل و دماغ پر تازہ ہے۔ بس اس یاد پر وقت کی ہلکی سی گرد پڑ گئی ہے۔

اس طرح کی نہ جانے کتنی یادیں ہیں جو میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اس گھر کی یادیں جہاں میں پلی بڑھی۔ جن کے سائے میں پرورش ہوئی۔ وہ انمول سایہ۔ ممتا کا وہ آنچل مجھ سے چھوٹ گیا۔ میری ماں اس جہان سے چلی گئیں۔ وہ ماں جن کا پیار، جن کی قربانی صرف میرے لیے ہی نہیں، میرے بھائی، بہنوں کے لیے بھی تھی۔ لیکن میرے لیے ان کے دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ شاید اس لیے کہ میں ایک لڑکی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں پرائی ہوں۔ پتہ نہیں۔ میں اکثر ماں سے کہتی۔ آپ سب کو گھر میں پڑھنے کے لیے کہتی ہیں، مجھے نہیں۔ ان کا جواب ہوتا۔ تمہیں کیا کہیں۔ تم تو خود سے ہی پڑھتی ہو۔ نہیں بھی پڑھوگی تو کیا ہو جائے گا۔ لڑکوں کا پڑھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ انہیں نوکری کرنی ہوتی ہے۔ گھر چلانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ میرا بہت خیال رکھتیں۔ خود بھوکی رہ کر مجھے کھلاتیں خود جاگ کر گرمی کے دنوں میں پنکھا جھل کر مجھے سلاتیں۔ یوں تو میرا مکان کھلا کھلا ہے۔ پھر بھی گرمی کی شدت اور بجلی کی مسلسل غیر حاضری نیند میں خلل پیدا کرتی ہے۔ خود میکے کم جاتیں اور مجھے بھیج دیتیں کہ دل بہل جائے گا پھر آ کر پڑھائی میں تو لگ جانا ہے۔ اس طرح میری پرورش کرتے کرتے وہ اس جہان فانی سے رحلت کر گئیں۔ اور حالات کے دھارے نے مجھے شہر بدر کر دیا۔

ٹرین میں بیٹھے ہوئے جب میں غازی پور جاتی ہوں۔ وہ ساری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں دیکھنے کو نگاہیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ کاش وہ ہوتیں اس دنیا میں اس گھر میں۔

گاڑی اپنی رفتار سے چلی جا رہی ہے اور میں اپنی یادوں کے بھنور میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔ میری یادوں کی رفتار و اور گاڑی کی رفتار تقریباً برابر ہے۔ ٹرین میں مونگ پھلی والے، چنے والے اور آئس کریم والے — ایک کے بعد ایک آتے جاتے رہے۔ میں ان سب کو دیکھ رہی ہوں۔

اچانک میرا دھیان ایک بھکارن پر نظر پڑتے ہی ٹوٹ گیا۔ میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ میں تقریباً چلا پڑی۔ ''سنو یہاں آؤ'' وہ رکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھ سے نظریں دو چار ہوئیں تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

پاس آئی تو میں نے پوچھا۔

''پہچان رہی ہو؟''

وہ مجھے نہیں پہچان سکی۔ لیکن میں اسے اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے دربھنگہ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ملی تھی۔

اس کو یاد دلایا تو تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

فطری طور پر سب سے پہلے میں نے یہ جاننا چاہا کہ وہ اس حالت میں کیسے پہنچی۔

اس نے بتایا۔ ''ہم تہرا کیھلے پر سسرال چلی گئیلی۔ بکی رستوا بھلا گئیل اور اسٹیشن پہنچ گئیلی۔ اونہا بھیٹر بھار رہل۔ بھر رات گاڑی آت جات رہل او ہے دیکھت دیکھت ہم سیر کر دہلیں۔''

''پھر بھر دن گھروا کھوجت کھوجت سانجھ کے پہنچ گئیلی۔ بکی ساسو جی گھر میں نا گھسے دہلیں۔ کہین کہ رات جانے کہاں بتا کے آئل با۔ کو کرم کر کے آئل با، ای بدچلن با۔ ایکے گھروا میں نا گھسے دیب۔''

''ہم ان کا صفائی دہین۔ لیکن او ہمار بات نا سنین۔ تبے سے ہم ایہی جے ہئیں۔ ہو سکے کبو پا بن دکھا جائیں۔ ہو سکے ہمکا کھوجت ہوئیں۔ تا ہم ان کے ساتھے گھر چل

جائیں۔''

تم اس کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ تمہیں کبھی نہیں لے جائے گا۔ اس ایک رات تم گھر سے باہر رہی تو بدچلن کہہ کر نکال دیا گیا۔ اب نہ جانے کتنی بدچلن راتیں تم پر سے گزر گئی ہیں۔ اب تمہیں بھلا کون لے جائے گا۔ تم اسی طرح اسٹیشن پر ٹرینوں میں بھیک مانگتی ہوئی زندگی گزار دو گی۔''

''بھگوان کی ایہی مرجی با— ایکے ہمار کا دوس۔'' کہتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ صرف دیکھتی رہی۔

■■

بھٹکتے ارمان

اس شخص کا دل و دماغ منتشر تھا۔وجہ؟اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔یہ لمحے بے قرار تھے، پلک جھپکتے ہی بیت جانے کو۔

لڑکی کیسی ہوگی اس کا مزاج کیسا ہوگا۔گھر کے ماحول میں گھل مل جائے گی یا نہیں۔خود اس کی خدمت کرے گی،اسے پیار کرے گی یا نہیں۔ان باتوں کی فکر اسے قطعی نہیں تھی۔وہ اس بات کے لیے فکر مند تھا کہ بیوی اتنا کچھ لا سکے گی یا نہیں جس سے اس کی عزت میں اضافہ ہو سکے۔موجودہ تہذیب وتمدن والے خاندان میں اس کی گنتی ہو سکے۔دوست اس سے مسکرا کر کہیں گے کہ تو بڑا خوش نصیب ہے جو ایسی لکشمی بیاہ کر لایا ہے۔اس انتظار میں اس نے زندگی کی کمیوں کو جھیلا تھا۔محرومیوں کا سامنا کیا تھا۔اور موجودہ سماج کے مقابلے میں آنے کے لیے ٹھاٹ باٹ سے رہنے کا سپنا دیکھا تھا۔

آج اس دن کا استقبال وہ بہت دھوم دھام سے کرنے والا تھا۔وہ چاہتا تھا اس کے سپنے کو پورا ہونے کے دن کا احترام بھی کرنا ہے۔جن سپنوں کو وہ اپنی پارچون کی دوکان سے پورا نہیں کر پایا تھا۔

بیوی تو واقعی لکشمی ثابت ہوئی۔وہ خوش ہوا اتنے سارے سامانوں کو پا کر۔

بیوی سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی اور ساتھ ہی خوشحال بھائیوں کی بہن بہت چہیتی۔مگر قسمت کی ایکدم کھوٹی۔جس کی مثال اس کی پہلی شادی تھی۔جو کافی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔لیکن شادی کی چوتھی کے دن پتہ چلا کہ اس کے سپنوں کا سوداگر حقیقت میں جسموں کا سوداگر ہے۔وہ صرف شادی شدہ ہی نہیں تھا بلکہ تین بچوں کا باپ بھی تھا۔

جب چوتھی کی دلہن میکے آئی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔قیامت کا سماں بن گیا۔سبھی حیران تھے کہ یہ لڑکی رخصتی کے وقت اتنا نہیں روئی اب اتنا کیوں رو رہی ہے۔ ماں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حقیقت کا سامنا کر سکے۔لیکن حقیقت سے آج تک کوئی منہ موڑ سکا ہے کیا۔

بھائیوں نے اسی وقت طلاق کے کاغذات تیار کرادئے۔

جس رشتے کو جوڑنے میں تقریبا دو ماہ لگ گئے تھے۔ وہ دو پل میں قلم کی ایک جنبش سے ٹوٹ گئے۔

دل و دماغ اور جسم تینوں سے وہ قطعی تیار نہیں تھی۔اس نئے شخص کو شوہر کی شکل میں قبول کرنے کو۔لیکن عورت ذات کی لاچاری جو وراثت میں اسے ملی ہے کہ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس نے اس شادی کے لیے حامی بھری تھی۔اور اب وہ مجھے من اور بکھرے سپنوں کے ساتھ اس شخص کا سہاگ سیج پر انتظار کر رہی تھی۔

سہاگ سیج پر اس نئے شخص نے خوب پیار جتایا۔اتنا کہ وہ اپنے تلخ ماضی کو پل بھر کے لیے بھول گئی۔اسے لگا زندگی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔سچ مچ یہ شخص اس کے تصور سے کہیں زیادہ اچھا نکلا اس کے خیالوں پر کھرا اترا۔اس کی زندگی میں بہار آگئی۔اس نے نئے ماحول اور نئے شخص کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔عورت ذات کہ زندگی کی کڑواہٹوں اور مشکلات کو کہاں تک جذب کر لیتی ہے۔یہی تو اس کی پہچان ہے۔

مینا بہت خوش رہنے لگی۔کیونکہ اس کے شوہر نے اس کے دل پر ہی نہیں دولت پر بھی راج کرنے لگا تھا۔

مینا اس سے پیار کرتی ہے یہ اس پر منحصر کرتا ہے کہ اپنے دل کا ہی نہیں جسم کا ہی نہیں اپنی جائداد کا بھی اکلوتہ وارث بنا دے۔اور اس نے ویسا ہی کیا۔

وہ شخص بیکل ہو اٹھا۔اس کی سوچیں کروٹ لیتی ہیں۔یہ جائداد جو اسے کاغذ کی شکل میں حاصل ہوئی ہیں۔کاش وہ اسے کیش کر پاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت کھانا کھاتے ہوئے اس کی بیوی کے گلے میں چاول کا نوالہ

اٹک گیا۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ ہاسپٹل لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے دوا لکھ کر پرچہ تھماتے ہوئے کہا۔
"جتنی جلدی ہو سکے دوا لے کر آئیے۔"

پرچہ لے کر وہ گیا تو دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ وہ اس وقت پہنچا جب اس کی بیوی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ ارد گرد ماں باپ بھائی بہن سبھی موجود تھے۔ اس کو ابتر حالت میں دیکھ کر اس شخص نے چین کی سانس لی۔

ظاہراً اس نے بھی آنسو بہائے۔ چین کی سانس بھی لی۔ لیکن اندر ہی اندر کسی بات پر خوفزدہ تھا، ساتھ ہی سنجیدہ بھی۔ سسرال والوں نے اسے سنبھالا۔

سب یہ سمجھ رہے تھے کہ بیوی کے غم میں سنجیدہ ہو گیا ہے۔

سسرال میں رہتے ہوئے اسے کافی عرصہ ہو گیا۔ لوگ چاہتے تھے جا کر وہ اپنی دوکان سمھالے۔ لیکن اس کی نگاہ دوکان کی طرف جاتی ہی نہیں تھی۔ اس کی نگاہ ایک طرف جا کر رک گئی تھی۔ اس کے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں پاتا تھا۔ اس کی سوچ اور توجہ کا مرکز اس کی سالی تھی۔ اس نے اپنی ساری طاقت اور توجہ اپنی سالی کو حاصل کرنے میں لگا دی۔

کاش اس کی جوانی اور چنچلتا اسے مل جاتی تو وہ خود کو کتنا خوش قسمت سمجھتا۔ یہ بات اس کے دماغ سے ہوتے ہوئے کسی طرح گھر والوں تک پہنچ گئی۔ اور اس کی سالی تک بھی۔ وہ اسے بڑے بھائی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ یہ عزت واحترام کے لائق ہیں، پیار کے نہیں۔ سالی کے اس ردعمل سے اس کے ہوش اڑ گئے۔ انجانے میں ہی اس کے اچھے سلوک کو پیار سمجھ لیا تھا۔ کسی وقت اس کی شوخی اور چنچلتا کے آگے اپنی بیوی کی سنجیدگی اسے بری لگی تھی۔ تبھی اس نے عہد کیا تھا۔ اس چنچلتا کو وہ ضرور قید کر لے گا۔ مرد کے اس زعم نے اس کی ہوس نے جانے کتنے ارمانوں کو توڑا ہے کتنی کلیوں کو مسلا ہے۔

وہ جانتا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد لوگ خود ہی سالی کو اس کی جھولی میں ڈال دیں گے۔ رواج بھی ایسا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے لوگ بیوی کے مرنے کے بعد سالی سے شادی کر دیتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ایسا ہوا نہیں۔

اس کی اس بری نیت کو دیکھ کر سسرال میں اس کا مان کم ہونے لگا۔ سبھی چاہتے تھے کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔

وقت نے کروٹ بدلی اور وہ اپنے گھر لوٹ گیا۔ سب نے راحت کی سانس لی۔

دن گزرتے رہے اور حالات جیوں کے تیوں بنے رہے۔

کچھ دنوں بعد مینا کی بڑی بہن کو خیال آیا کہ چل کر دیکھوں کہ وہ کس حال میں ہے۔ وہ اس کے اس ناپاک خیال سے غیر آشنا تھیں۔ دھڑکتے دل سے وہ اپنے وہاں جانے کے ارادے کو مستحکم کیا اور چل پڑیں۔

دبے پاؤں سے گھر میں قدم رکھا۔ سناٹا دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ اندازہ ہوا گھر میں کوئی اور نہیں ہے۔

پردے کی اوٹ سے کمرے میں دیکھا وہ مینا کی تصویر سامنے رکھ کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بہن کی یادوں سے آج بھی وہ آزاد نہیں ہو سکا۔ اس کی بہن کی موت کامیاب ہو گئی۔ کیوں کہ اس کے پیچھے رونے والا اس کا شوہر جو زندہ ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ حقیقت میں وہ اس کی بہن کو پیار کرتا تھا۔ بیوی سے پیار کرنے والا شوہر بڑی قسمت سے ملتا ہے۔ وہ بے چین ہو اٹھی اس کے پیار بھرے الفاظ سننے کے لیے۔ اور سانس روک کر پردے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ وہ شخص اس تصویر سے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کتنی تکلیف ہوئی ہوگی مرتے وقت۔ سوئی کے ننھے ننھے ٹکڑے تمہارے گلے سے ہوتے ہوئے سینے تک پہنچے ہوں گے اور نہ جانے کس کس جگہ پہنچے ہوں گے۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم مجھے معاف کر سکوگی۔ میں ان سوئی کے ٹکڑوں کو ہر وقت اپنے سینے میں چبھتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

بیوی تصویر میں خاموشی سے مسکرا رہی تھی۔ مانو کہہ رہی ہو، معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار تو تم مردوں کو ہی ہوتا ہے۔ تم نے تو میری زندگی کے اتار چڑھاؤ دشواریوں کو، زندگی کی ہلچل کو اپنی لالچ کے ایک جھونکے سے شانت کر دیا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ تمہارے

ارمان اسی طرح بھٹکتے رہیں زندگی کا سکھ بھوگنے کی بیتابی ہمیشہ قائم رہے۔ کبھی شانت نہ ہو...... کبھی شانت نہ ہو......

بیوی کی تپتی آتما کو مرد کی آنکھوں سے نکلی بارش کی دو بوند نے شانت کر دیا۔

■■

ہونٹوں کی دہلیز

شکن کسی بھی نظر کو کھٹکتی کیوں ہے۔ شکن چاہے ماتھے کی ہو، چاہے کپڑے کی یا چادر کی۔ کسی بھی دیکھنے والی نظر کو مختلف خدشوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جب بھی ندھی جینت کو دیکھتی ہے۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہے اور اس کا مسکراتا چہرا پل بھر کے لیے مرجھائی ہوئی کلی کی مانند سکڑ جاتا ہے۔ اس بے رنگ چہرے پر کتنے سارے سوال ابھرتے ہیں۔ لیکن ہونٹوں کی دہلیز پار نہیں کرتے۔ کیوں کہ ندھی کے چہرے کی سلوٹیں اس کے چہرے اور ہونٹوں پر کرفیو لگا دیتی ہیں اور پھر وہ پوری طرح ندھی کی طرف دیکھ بھی نہیں پاتا اور نہ کچھ بول پاتا۔

وہ جانتا ہے کہ اگر اپنے قصور کی تلافی کا ذکر بھی کیا تو ندھی برس پڑے گی اس پر۔ اور اس کے من پر جو گھنے بادل برسوں سے اٹھ رہے ہیں۔ اس کی گھن گرج اور بوچھار کو وہ نہیں جھیل سکے گا وہ بھیگ جائے گا بری طرح۔ اس بری طرح کہ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ صاف دکھائی دینے لگے گا۔ جسے صرف ندھی ہی نہیں سارے لوگ دیکھیں گے۔ لیکن بیس برسوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ندھی اس کی بے عزتی کرے۔ اس کی عزت اور بے عزتی اس کے سینے میں پوشیدہ ہے۔ اس کے برے سلوک کو وہ ہمیشہ اپنے ارد گرد محسوس کرتی ہے۔ پرچھائیں کی مانند، پرچھائیں ان بیس برسوں میں کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوئی۔ اس کے سلوک کو بھی کتنا چاہا ہے اس نے۔ ٹوٹ کر، بکھر کر، ہنس کر، رو کر اور خاموش رہ کر۔

لیکن اس کی سوالیہ نگاہیں ندھی کو بے چین کر رہی ہیں۔ مجبور کر رہی ہیں اس پر ترس کھانے کو۔

وہ کیا چاہتا ہے۔ یہی نا کہ میں اپنے دل کے اندھیرے میں بند سوالوں کو روشنی میں لاؤں اور ان سارے سوالوں کو جواب دے کر ان برسوں سے لگی دل و دماغ کی چوٹ کو ایک معافی جیسے لفظ سے دھوڈالوں نہیں...... ایسا نہیں ہوگا۔

جسے چاہا ہے اسے بدنام کیسے کروں؟ یہی بات اسے روکے رکھتی ہے۔ اس نے جو اسے لمحہ بھر کی چاہت تھی۔ اس سے کہیں زیادہ صدیوں کے لیے نفرت دے دی۔ ندھی ہمیشہ سوچتی کہ اس کی نفرت کو دل سے اکھاڑ پھینکے۔ مگر وہ نفرت پختگی سے اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

کاش بچپن سے ہی کوئی اس بات کو دل میں بٹھا دیتا کہ کسی کی طرف بھر نظر دیکھنا مت۔ بھر نظر دیکھنے کا ہی تو قصور ہے کہ کوئی نظروں سے ہوتے ہوئے دل میں اتر جاتا ہے اور مختلف اذیتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسی اذیت جو رویں رویں کو زخمی کر دیتی۔ ہر لمحہ کو دردناک، مایوس کن اور بے رنگ کر دیتی ہے۔ کیا جینت کی بھی زندگی بے رنگ ہوئی ہے۔ نہیں اگر اس کی بھی زندگی بے رنگ ہو جاتی تو شاید اس کے قصور کی تلافی ہو جاتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی زندگی کو کامیاب کر لیا۔ اپنی زندگی میں بہت سارے رنگ بھر لیے۔ مجھے بھول کر۔ اس نے سمجھا ہوگا۔ میں بھی اس کی طرح موقع پرست ہوں۔ نظروں سے دور رہ کر سب کچھ بھول جاؤں گی۔ نہیں۔ تم تو پیار میں پھولوں کی خوشبو سمیٹتی تھی اور میں نے کانٹوں کو چنا تھا۔ پھول مرجھا گئے خوشبو بھی مر گئی۔ کانٹے نہ مرجھائے نہ مرے۔ اس لیے اس کا ساتھ نہیں چھوٹا۔

اب چوبیس برسوں بعد اسے علم ہوا کہ میں نے اس کے دیئے ہوئے کانٹے کی کتنی حفاظت کی ہے۔ تو اسے پچھتاوا ہوا۔ شرمندگی ہوئی۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جائے اپنی زندگی میں خوش رہے۔ رنگ برنگی زندگی میں۔ میرے کانٹوں کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرے۔ بار بار میرے سامنے آکر۔ مجھے کیوں پریشان کرتا ہے۔

یہ کانٹے مجھے راستہ دکھاتے رہے کہ ہر قدم پر صرف میرا اور میرا ہی ساتھ ہے۔ اس نے میری رہبری کی ہے۔ مجھے ہر موسم میں جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ کبھی نہ مرجھانے کا سبق سکھایا ہے۔ کانٹوں سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ پھر بھی ان میں زندہ رہنے کی چاہ رہتی ہے۔ دوسروں کو

سبق سکھانے کے لیے کہ دیکھو میں سب کی بے رخی کا شکار ہو کر بھی زندہ ہوں۔

کسی نے ایک بار کہا تھا کہ پیار میں جسم کو علیحدہ رکھ کر پیار کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پیار میں جسم کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ جسم کی بہت بڑی کشش ہوتی ہے۔ جو لوگ اسے الگ رکھ کر سوچتے ہیں دراصل وہ پیار کی گہرائی سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ غلط کہتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔

سچے پیار کی کسوٹی ہی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سونپ دیں۔ ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ لیکن یہ باتیں ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو ضم ہو کر الگ نہیں ہوتے۔ دور نہیں جاتے۔ نہ نظروں سے، نہ دل سے، نہ زندگی سے۔

ماتھے کی شکن کے ساتھ ہی نگاہوں میں بیس سال قبل کی وہ شکن تیر گئی۔ جو چند لمحے لیٹنے کے بعد چادر پر پڑ گئی تھی۔ یکبارگی اس پر نظر گئی تو وہ نظر کو کھٹکنے لگی۔ جسے فوری طور پر اس نے برابر کر دی تھی۔ وہ شکن چادر کی تو اسی وقت برابر ہو گئی۔ لیکن اس کی زندگی میں جو شکن پڑی تھی وہ آج تک برابر نہیں ہو سکی۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اور دوسروں کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

وہ لمحہ کتنا مخصوص تھا جو ساری زندگی پر چھا گیا۔ اس لمحے نے اسے اپنی آغوش میں لے کر ساری زندگی کے لیے محفوظ کر لیا۔ مجھے وہ لمحہ بہت پیارا ہے کیونکہ میں نے جو جذبات پیار میں سنجو کر رکھا تھا۔

تمہارے پیار نے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ اس کا جسم کانپ گیا تمہارے الفاظ سن کر۔

ویسے بھی اس ملاقات کے بعد تم مجھ سے لاتعلق سے ہو گئے تھے۔ ملنے کی کوئی چاہت تمہارے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ اور میں جس اندیشے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جب اس اندیشے کا یقین ہو گیا تو بے تحاشہ تم سے ملنے چلی گئی۔ تمہارے پاس اپنے دکھ کو پناہ دینے کے لیے۔

مگر کافی دیر تک تم خاموش رہے اور وہ بولتی رہی۔ تم نے نگاہیں بدل لیں کہیں زبان بھی نہ بدل لو۔ دل کھلونا تو تھا نہیں کہ ٹوٹ جاتا اور فریاد بھی نہ کرتا۔

تم نے اپنی گہری خاموشی توڑ کر کہا۔

''ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔شاید تم سن کر برداشت نہ کر سکو۔''
تم کہہ تو سکو گے نا۔ کہہ دو۔ میری فکر مت کرو۔ مجھے نہ سہی تم کو تو راحت ملے گی نا! لہٰذا کہہ دو۔

تم نے منہ دوسری طرف گھما کر کہنا شروع کیا۔''میری جس غلطی کو تم اپنے جسم میں لیے گھوم رہی ہو۔ اس کا الزام کسی اور کو دے کر مجھ سے جتنا روپیہ لینا چاہو لے لو۔ یا جس کے ساتھ کہو تمہیں بیاہ دوں، اپنے ہاتھوں سے۔''

اس کے سینے میں کٹاری بھونک دی ہو جیسے موت کی طرح بھیانک ہو گیا یہ کمرہ۔

کہا تھا نا کہ تم کو شاید برداشت نہ ہو۔

وہ ہنستے ہنستے رو پڑی تھی۔ سچ مچ تم نے جو بات کہی تھی اس کے لیے پتھر دل چاہئے۔ تم نے اپنی غیرت کا گلا گھونٹ دیا۔تم میں بڑی ہمت تھی یہ سب کہنے کی۔

جا رہی ہوں اب کبھی واپس تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ اور پھر تمہاری زندگی سے دور چلی گئی۔ بہت دور۔

اس کے بعد کبھی بھی تم نے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن وہ جہاں بھی رہی تمہاری خیریت معلوم کرتی رہی۔

تمہاری تو عادت ہی تھی۔ ہر غیر ضروری چیز کو اپنے ذہن سے جھٹک دینے کی۔ جب وہ کسی بات کو لے کر پریشان ہوتی تو اس سے بھی کہا کرتے تھے۔ جھٹک دو ان فالتو باتوں کو۔ مجھے بھی فالتو سمجھ کر جھٹک دیا۔

اور تب سے اب تک پل پل کی خبر تمہاری میں رکھتی رہی۔تم نے شاید ایک پل بھی یاد نہ کیا ہو۔ کاش وہ بھی تمہاری طرح تمہارے الفاظ جھٹک دیتی تو آج اتنی ویرانی کی زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔

تم نے اپنا گھر بسایا۔ زندگی کی ہر خوشی حاصل کی۔ ہر موسم کا لطف اٹھایا۔ اور اب تو تم نے اپنے بچوں کو بھی بیاہ دیا ہے۔ اور میں۔

ہر لمحہ تمہارا ایک ہی جملہ اسے چھلنی کرتا رہا،'' تم جس سے کہو بیاہ دوں۔''

اب بیس برس بعد تم اس سے مل رہے ہو۔ پتہ نہیں کس جذبے کے تحت۔ تم شاید مجھ سے یہ جاننا چاہتے ہو کہ میرا کیا ہوا۔ تمہارا عکس جو میرے وجود میں داخل تھا اس کا کیا ہوا۔ تو سنو۔

''میں نے اسے ختم کر دیا تھا۔ اپنی ممتا کا گلا بغیر سوچے سمجھے گھونٹ دیا۔ لیکن میں جلد بازی کی۔ اپنے وجود سے نکال کر پھینکا تھا اسے۔''

اس گناہ کے لیے مالک کے دوربار میں شرمسار ہوں۔ کیوں کہ تم نے اسے دوسرے کے نام سے جوڑنے کی کوشش کی۔ ایسی بات کیوں کہی۔ اپنا ماننے سے انکار کیوں کر دیا۔ اس معصوم کو میں نے کبھی نہ ختم کیا ہوتا۔ اگر تم خاموشی سے منہ موڑ لیتے۔ میں اس انتظار میں ہی زندگی گزار دیتی کہ کبھی تو تم آؤ گے۔ میرے لیے نہ سہی اپنے خون کے لیے۔ زمانے کے طنز ایسے بھی کیا کم جھیلے ہیں اسے لے کر بھی جھیل لیتی۔

کاش تمہارے وہ الفاظ تمہارے ہونٹوں کی دہلیز نہ پار کرتے تو آج میں۔ اتنی تنہا...... اتنی مضطرب نہ ہوتی۔

■■

وقت کی سازش

رمیش نیلو کے قریب کھڑا چیخ رہا تھا۔ دیکھو گھر کی ایک ایک چیز پر نظر ڈال کر دیکھو۔ یہاں کی ایک ایک چیزیں میری لائی ہوئی ہیں۔ گھر کا ایک ایک سامان تمہارے لیے میرا جٹایا ہوا ہے۔ پھر اس کے بازو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جاتا ہے۔ جہاں عیش و آرام کے سامانوں سے کمرہ کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ ایک ایک سامان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے وہ بولے جا رہا تھا۔

"اس میں سے کوئی بھی چیز تمہاری لائی ہوئی نہیں ہے۔ تم یہ سارا سامان گھر سے لے کر نہیں آئی تھی۔ تمہارے تن کا یہ کپڑا بھی تمہارا نہیں ہے۔"

اس کے الفاظ تیر کی طرح چبھ رہے تھے اور نظروں کی جنبش ہتھیار کی مانند وار کر رہی تھی۔ مگر وہ خاموشی سے من میں طوفان اور آنکھوں میں آنسو لیے سنتی رہی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے وہ، سب اسی کا تو ہے۔ وہ کچھ بھی لے کر نہیں آئی تھی۔ سوائے خالی من کے۔ جس میں رامش کی زندگی کا روزنامچہ اسے بھرنا تھا۔ پانچ سال سے یہی تو کر رہی تھی وہ۔ اب چھٹا سال لگ گیا ہے۔ اس کی خوشی کے لیے ہی تو جی رہی ہے وہ۔ اس کے قریب آ کر من آتما اور جسم کی ساری دوریاں مٹا دی۔ اور اب کہتا ہے کہ اس کا کوئی حق نہیں ان چیزوں پر اس گھر پر۔

لوگوں کی مرضی کے خلاف اس سے پیار کیا۔ ماں باپ چھوڑے اور اس جان پہچان کے آدمی سے ناطہ جوڑا۔ ازدواجی زندگی کے بندھن میں بندھی۔

اور اب اسی بندھن کے بنا پر اس کی دہلیز پر کھڑی حق کی بھیک مانگوں تو کیا وہ

دے سکے گا۔ میرے اس حق کو بھی وہ نکار رہا ہے۔ اس لیے اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ سوچ کر من دکھی ہو اٹھا۔ آنکھوں سے زار زار بارش ہونے لگی۔ خاموش بارش۔ کوئی گھن گرج نہیں۔ گھن گرج کے ساتھ برسنے کی کوئی تمنا نہیں۔ صرف برسنا ہے۔ من کو خالی کرنا ہے۔ رامش کے پیار کی بوچھار جو من پر برف بن کر جم گئی تھی۔ رامش کی گرم گفتگو سن کر برف پگھل پڑی۔ اور چہرے پر کوئی کمزوری ابھر آئی۔

''مجھ پر رحم کرو رمیش، میں کہاں جاؤں گی تم کو چھوڑ کر۔''

''میں نے کہہ دیا تھا نا کہ تمہارا اس گھر میں کچھ نہیں کوئی حق نہیں۔ انہیں کے گھر چلی جاؤ جن پر تم نے میری کمائی کے روپیہ خرچ کیے تھے۔''

''مجھے وہاں کوئی نہیں رکھے گا۔'' لہجہ میں التجا تھی۔

''میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا کہتے ہوئے رمیش نے دونوں بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو ابھی ابھی باہر سے کھیل کر آئے تھے۔ اچھلتے کودتے خوشی سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ مگر یہاں کا گرم ماحول دیکھ کر سہم گئے تھے۔ دیکھو اس گھر میں تمہاری کوئی چیز ہے تو یہ بچے۔ تم انہیں ساتھ لے جا سکتی ہو۔'' کہہ کر وہ دوسری جانب چلا گیا۔ اور وہ بچوں میں مگن ہو گئی۔

بچوں کی باتیں سن کر من میں ٹھنڈک پہنچی کہ اس گھر میں یہ معصوم بچے اس کے ہیں۔ تو یہ بچے رمیش کے نہیں ہیں۔ ان بچوں کی خاطر ہی وہ اس گھر میں اسے نہیں رکھ سکتا۔ مجھے گھر سے بے گھر کرنے پر تلا ہوا ہے۔

آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ رات گہرانے کے ساتھ ہی تارے بھی جاگ جاگ کر تھک چکے تھے۔ اونگھنے لگے تھے۔ ان کی جانب کھلے آسمان کے نیچے لیٹی ہوئی نیلو سوچ میں گم تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور۔

آنگن میں ہلکی ہوا کے چلنے کا احساس امرود کے پیڑ کی پتیوں کے ہلنے سے ہو رہا تھا۔ ایک تو فضا کی گرمی امس پیدا کیے ہوئے تھی۔ دوسرے حالات کی گرمی۔ من کے بھیتر گھٹن کو جنم دے رہی تھی۔

نیلو کو یاد آیا۔ جب شادی کے چار ماہ بعد رمیش اسے چھوڑ کر عرب چلا گیا تھا اسی کی خوشی کے لیے۔ سارے جہان کا عیش و آرام اس کے قدموں میں لا کر ڈال دینے کے لیے ہی تو سات سمندر پار گیا تھا۔ اسے میکے میں چھوڑ کر۔

تب اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ اس نے وہ دن بڑی مشکل سے گزارے تھے۔

اسے یاد آیا وہ پلنگ پر لیٹتے ہی بےچین ہو جایا کرتی تھی۔ اسی اضطراب کی حالت میں رمیش کے خیالوں میں کھوئی ہوئی نیند کی آغوش میں چلی جاتی۔ خوابوں میں اکثر وہ اس کے ساتھ ہوتی۔ ہر لمحہ کا لطف اٹھاتی ہوئی حسین اور لذت آمیز لمحہ کو اپنے اندر جذب کرتی جاتی۔

آنکھیں کھلنے پر وہ حیران ہو جاتی کہ رمیش تو سات سمندر پار ہے۔ سات سمندر پار ہوتے ہوئے بھی وہ ابھی کتنے قریب تھا۔ جاگتے لمحے اسے ڈستے۔ وہ کوشش کرتی کہ زیادہ تر وہ نیند میں ہی رہے۔ تاکہ رمیش کے قریب رہ کر اس کا ساتھ مٹھاس بخشتا رہے۔

شادی کے بعد شروع کے دن بہت خوبصورت تھے۔ پھولوں کی گندھ میں لپٹی ہوائیں سرور بخشتی تھیں۔ اس خوشگوار فضا میں نہ جانے کتنی تمناؤں کی کلیاں چٹک کر کھل جانے کو انگڑائیاں لے رہی ہوتی تھیں۔

ان خوشیوں میں گھر کے لوگوں کی جدائی کا غم اور طنز کا تیکھا پن سب دب سا گیا تھا۔

اس کی غلطی یہی تھی کہ عرب سے جو روپے اس نے کما کر بھیجے تھے۔ اسے بیدردی سے خرچ کر ڈالا تھا۔ میکے والوں پر چھوٹی بہن کی شادی پر۔ خاصی رقم بھائی کے زور دینے پر دے ڈالی تھیں۔

پہلی بار جب رمیش عرب سے دو سال بعد لوٹا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ دوسری بار جب گیا تو نیلو پر اس کے میکے والوں کا پیار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس کی عزت بڑھ گئی تھی۔ عرب سے آنے والے پارسل اور موٹی رقم کی چمک دمک نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا۔ نیلو جانتی تھی کہ یہ رقم رمیش کی امانت ہے۔ پھر بھی رمیش پر بھروسہ تھا کہ کبھی بھی وہ اس سے روپیہ پیسہ کا حساب نہیں لے گا۔ بقول رمیش کے میں صرف تمہارے لیے ہی اتنی دور جا رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں چھوڑ کر تمہاری جدائی جھیلنے کا مجھے شوق نہیں۔ تمہارے آرام کے لیے تاکہ تم من مانے ڈھنگ سے

آرام کی زندگی گزار سکو۔ عیش و آرام سے دور زندگی تلخیوں میں بدل جاتی ہے۔ میں تمہیں خوب چاہوں اور تمہارے آرام کے لیے کچھ نہ کروں تو تمہیں بھی میرا پیار بوجھ لگنے لگے گا۔ پیار کے اظہار کا طریقہ آرام پہنچانے میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں صرف تمہارے لیے ہی جارہا ہوں۔

لیکن یہ کیسی تلخی گھول دی تم نے وہاں سے دوبارہ آ کر۔ آنسو کی ایک گرم دھار رخسار کو نم کرنے لگی۔ کاش مجھے رمیش پر ذرا بھی شک ہوتا کہ کبھی وہ تیور بدل بھی سکتا ہے تو اس گمان کو اپنے من میں کبھی نہیں پالتی۔

عورت کو مرد پر اس کی محبت پر کبھی گمان نہیں کرنا چاہئے۔ ناز کرے مگر گمان نہیں۔ یہ بات اب سمجھ میں آئی۔ لیکن عورت کا گمان توڑنے میں مرد کو بڑی تسکین ملتی ہے۔ اس کی انا کو جلا ملتی ہے۔ میرے گمان کو توڑ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ میرے کامل یقین کو توڑ کر ٹھیس پہنچا کر وہ بھی سکھ سے نہیں رہ سکے گا۔

میں بھی اس سے کم نہیں۔ اس کے پاس روپیہ ہے تو میرے پاس ڈگریاں ہیں۔ فرسٹ کلاس ایم اے یہ کس دن کام آئیں گی۔ شاید اسی دن کے لیے میں نے پڑھائی کی تھی۔ لگتا ہے اس کے استعمال کا وقت آ گیا ہے۔

میں نے رمیش کی خوشی کے لیے ہی اب تک اپنے ڈھنگ سے جینے کی چاہت کو، نوکری کرنے کی تمنا کو ختم کر دیا تھا۔ آج یہ تمنا پورے ویگ کے ساتھ جوش مارنے لگی۔ میں شادی کے پہلے سے ہی اس کے حکم کی تعمیل کر رہی ہوں۔ اس کے کہنے پر پڑھائی میں اپنا دل لگایا اسی کے کہنے پر پڑھائی سے دل ہٹایا۔ اس کی ہنسی سے ہنسی اس کی خاموشی سے خاموش رہی۔

آج میرا گمان ٹوٹ گیا کہ تم مجھے بے طرح چاہتے ہو۔

میں تمہارے پاس سے چلی جاؤں گی۔ یہی اچھا ہوگا۔ ایک دو دن میں ضرور چلی جاؤں گی۔ یہ سوچ کر اٹھی۔ گھر کی چیزوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ اور تمام کاغذات سرٹیفکیٹ بریف کیس میں رکھا۔ بچوں کے کپڑے باسکٹ میں ڈالے اور پھر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

من کسی طرح بھی راضی نہیں ہوا جانے کو ایک دو دن اور دیکھ لوں شاید۔

شام کو رمیش گھر لوٹا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مسکراہٹ دیکھ کر من کو ہلکا سا

چین ملا۔ شاید اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ کاش ایسا ہو جائے۔ کاش وہ ٹوٹنے سے بچ جائے۔ دو بچوں کو لے کر زندگی کی شروعات آسان نہیں تھی۔ نہ جانے نوکری حاصل کرنے کے لیے کس کس سے پالا پڑے۔ جگہ جگہ روپیہ خرچ کرنے کون دے گا۔ گھر پر والدین اور بھائیوں پر کب تک بوجھ بن کر رہ سکوں گی۔ پتہ نہیں بھاوج کو برا لگے۔

پھر بھی خود کی صلاحیت اور ڈگریوں پر بھروسہ تھا کہ وہ اس کا ساتھ ضرور دیں گی۔

رمیش نے بتایا کہ رات کے کھانے پر کسی کو بلایا ہے۔ کھانا ٹھیک سے تیار کرنا۔ نیلو کے من کو سکون ہوا۔ وہ مہمان کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی اور خوب محنت سے کھانا تیار کرنے لگی۔

مہمان تو آنے والی لڑکی تھی۔ ایک بہت خوبصورت لڑکی۔ دیکھ کر تن بدن سلک اٹھا۔ تمہارا ایک روپ یہ بھی ہو سکتا ہے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سپنے میں کیسے سوچتی۔ سپنے میں تو ہمیشہ تم نے مجھے سینے سے لگا کر پیار ہی کیا ہے۔ ایسی باتوں کو سوچنے کی فرصت ہی کہاں۔

وہ برابر مسکرائے جارہا تھا۔

اس بے سہارا لڑکی کو میں گورے گاؤں بمبئی سے لایا ہوں۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میری طرف بے طرح کھینچتی چلی آئی۔ اگر بتادیتی تو وہ بھلا کیوں آتی۔ اب یہ جان بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ میں اس سے بیاہ کر چکا ہوں۔ اب میری بیوی بن چکی ہے۔ اور اب اسی گھر میں رہے گی۔

نیلو کا تمتماتا چہرہ، سرخ آنکھیں اور بے قرار من اس پر رمیش کی باتیں سب بے محل تھا۔

رمیش نے نیلو کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے کہا— ''اب کھانا لگادو۔ کھا کر آرام بھی تو کرنا ہے۔''

میرا آرام حرام کر کے یہ آرام کرے گا۔ رمیش کا اصلی روپ گھناؤنا ہوگا۔ سوچ کر پھر سے کانپ گئی۔ اپنی اسی غرض کی خاطر اسے گھر سے نکال رہا ہے۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو بہکا کر لایا ہے۔ اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھائے گا۔ کیا اسی کھوٹے سے وہ دیوانہ وار محبت کرتی رہی۔

قربت کے سارے رشتے اس نے بھلا دیے۔

کیا میں بھول سکوں گی۔ میں بھی کیوں نہیں بھول جاتی۔ من چھٹپٹا اٹھا۔ دونوں کھانا کھا کر کمرے میں جا چکے تھے۔

رات گہراتی جا رہی تھی۔ باہر کا اندھیرا اس کے اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ ناسور کی طرح درد دینے لگا۔

کالی رات اندھیرے میں ڈوبی سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

پورا تن بدن پتھرا گیا۔ سوکھے ہونٹ بھیگی پلکیں۔ بکھرے بال لیے وہ اس بند دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک بے بس لڑکی کو رمیش بے حسی سے......

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ جب تک وہ دونوں سو کر اٹھتے نیلو دونوں بچوں کے ساتھ میکے جا چکی تھی۔

وہاں کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کوئی کچھ پوچھے۔

اس طرح دو چار دن بیتے۔ دل شانت ہوا تو اس نے سوچا سرٹیفیکیٹ نکال کر اس کی کاپی کرالوں تا کہ نوکری کے لیے درخواست دی جا سکے۔

لیکن یہ کیا؟

جیوں ہی بریف کیس کھولا سرٹیفیکیٹ کے انگنت ٹکڑے پنکھے کی تیز ہوا سے کمرے میں بکھر گئے۔

■■

قیامت صغریٰ

شراب کی گرمی سے چہرہ بھبھک رہا تھا۔ روبینہ نے پہلی بار دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

''آپ شراب پیتے ہیں؟''

''جس میں حیات بخش قوت ہو وہ شراب نہیں، امرت ہے۔'' جب اجیت نے جواب دیا تو شالنی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نشے میں ڈوب کر اور خود کو بھول کر ہی تو وہ اپنے دل اور ہونٹوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ بغیر نشے کے تو وہ شالنی میں کوئی کشش محسوس ہی نہیں کر پاتا۔

''مجھے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے، مگر سچائی یہی ہے چترا کہ وہ شراب پیتا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔ چترا کا دل بھی پگھل گیا۔

شالنی کی موجودہ تکلیف کا احساس چترا کو اپنے ماضی میں لے گیا۔ جہاں دونوں سہیلیاں انجان اور ناآشنا تھیں — اگست کا پہلا ہفتہ — اور مہیلا کالج کا وسیع صحن۔

بارش کی رم جھم کے بعد ماحول خوشگوار — ہریالی کا نظارہ دیکھتے بنتا تھا۔ کالج کے صحن میں سر سبز و شادابی کی بچھی چادر پر بیٹھی طالبات کا جھنڈ ان نئی طالبات کے خیر مقدم کو تیار تھا۔ جو بی اے کے سال اول میں داخلہ لے رہی تھیں۔

چترا سال اول بی اے کا امتحان دے چکی تھی۔ اور اب وہ سال دوئم میں تھی۔ نئی لڑکی کا خیر مقدم وہ صرف نگاہوں سے کر رہی تھی۔ ریگنگ یا ہوٹنگ کا رواج یہاں نہیں تھا۔ اسی بیچ کالج کے کسی حصے سے شالنی نمودار ہوئی۔ اور جھنڈ میں بیٹھی چترا سے دیپا میڈم کے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ قدرت نے اس کی زبان میں اتنی مٹھاس اور چہرے میں اتنی کشش عطا کی تھی

کہ جھنڈ کی ساری لڑکیاں اب اس کو گفتگو کرتے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔

گورے مکھڑے اور سڈول جسم کے ساتھ ہی نرگسی آنکھیں، موٹے لیکن رسیلے گلابی ہونٹ، لمبے بال اور درمیانہ قد۔ یہ ساری چیزیں ایک ساتھ مل کر اس کے حسن میں چار چاند لگا رہی تھیں۔

شالنی نے جب بی اے میں داخلہ لیا تو روز چترا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہونے لگا۔ اب دونوں میں فطری طور پر قربت بڑھنے لگی دونوں میں سے ایک اگر کسی دن کالج نہیں آتی تو دوسری بے چین ہو کر انتظار کرنے لگتی۔ نگاہ کالج کے گیٹ پر لگی رہتی۔ دل کرتا کسی بھی طرح اس کے پاس پہنچ جائے۔

شالنی جب بی اے سال دوم میں پہنچی تو ایک مہذب اور خوبصورت لڑکے کی تلاش شروع ہوگئی۔

اچانک ایک دن شالنی سج دھج کر سونے چاندی کے زیورات سے لدی، بنارسی ساڑی میں ملبوس جب کالج کی سہیلیوں کے سامنے آئی تو اس کے حسن کا نکھار دیکھتے ہی بنتا تھا۔ اس کے حسین رخسار میں چار چاند لگ گئے تھے۔

پیشانی پر بندی، مانگ میں چوڑا سیندور، چہرے پر مسرت کی لہر، اس پر اس کے شوہر کا ایک بڑا تاجر ہونا سونے پر سہاگے والی بات تھی۔

شادی کے بعد شروع شروع میں کالج آتی رہی۔ لیکن گونا ہو جانے کے بعد سسرال والوں کی مرضی سے اسے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ گونے پر گئی تو پورے ڈیڑھ برس بعد لوٹی اس کی ساس پرانے خیال کی ہونے کے سبب رسم و روایات کی پاسداری کرتیں۔

شالنی نے بھی سوچا ان سب کے مطابق چلنا ہی خاندان کی عزت کے حق میں مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سال بعد جب لوٹی تو چہرے کی چمک دمک جاتی رہی تھی۔ لیکن اس کے آنے پر چترا کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔

شالنی نے چترا کو بتایا۔ ’’اجیت اس کے جسم کا وحشیانہ طریقہ سے استعمال کرتا ہے۔

اس کی آمد سے ہی صرف کمرے میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔''

''اسی لیے تم اپنے بناؤ سنگھار سے بے پرواہ ہوگئی ہو۔ شیشے میں اپنا چہرہ تو دیکھو۔ تم اپنے آپ سے ڈر جاؤ گی۔'' چترا نے جب اس سے ایسا کہا تو وہ چند لمحوں کے لیے متفکر ہوگئی۔ پھر اٹھ کر غسل کرنے چلی گئی۔ تب تک چترا بیٹھی البم دیکھتی رہی۔

چترا اسے تیار ہو کر مارکیٹ چلنے کی ضد کر رہی تھی۔ جسے شالنی ٹالنا چاہتی تھی۔ لیکن دکھ سکھ کی ساتھی چترا ہی تو تھی جو اس کے سسرال سے آنے کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے دل کے قریب تھی، اس کے گھر کے قریب تھی اور ان سب سے بڑھ کر اس کی رازدار دکھ درد کی رازدار۔

چترا سوچ رہی تھی۔ وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے کس طرح اس کے حسن و جوانی کی تازگی کو پامال کر دیا ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ شادی کے بندھن سے ابھی تک آزاد۔ اتنی جلدی بھی کیا تھی شالنی کے والد کو اس کی شادی کی۔

شالنی جب نہا کر نکلی تو اس کے حسن پر جو پچھلے ڈیڑھ سال کی دھول جمی ہوئی تھی وہ صاف ہوگئی۔ اس کا چہرا گلاب کی طرح کھل گیا۔ گویا بدلی سے ابھی ابھی چاند نکلا ہو۔

شالنی حالات کے ساتھ جینا جانتی تھی، اس لیے اس نے پچھلی باتوں کو بھلا کر میکے آنے کا لطف اٹھانا چاہا۔ اور تیار ہو کر باہر نکل گئی۔ دن بھر گھومنے پھرنے کے بعد جب گھر لوٹی تو اجیت کو موجود پایا۔ اسے دیکھ کر خوف سے چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

چترا ہی بولی— ''کیوں جیجا جی دو چار دن بھی نہیں رہ سکے شالنی کے بغیر؟''

'نہیں ماں کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ انہوں نے شالنی کو بلایا ہے۔'' اجیت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اجیت کی بات سن کر چترا کو آگے کچھ کہنے کو دل ہی نہیں ہوا۔ چترا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شالنی اتنی جلدی چلی جائے گی۔ ماں کی بیماری سن کر بات کو ٹالنا شالنی کے بس کی بات نہیں تھی۔

بالآخر دونوں دوسرے کمرے میں جا کر آخری بار ایک دوسرے کو دکھ درد سنانے لگی۔
شالنی بولی—'' چترا! میں وہاں اتنی اکیلی ہوں کہ بتانا مشکل ہے۔ تمہار جیجو دیر رات گئے آتے ہیں۔ جب میں نیند میں پوری طرح ڈوب جاتی ہوں۔ گلاس میں شراب ڈالنے کی آواز سن کر جاگتی ہوں اور گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔''
دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ماں نے آ کر تیاری کرنے کو کہا۔
ماں بھی کتنی سخت دل ہوگئی ہے۔ روک نہیں سکتی۔ سخت دل نہیں، مجبور۔ شالنی انہیں خیالوں میں گم ہوگئی۔

اصل میں ماں ظاہر کر رہی تھی کہ سسرال جانا ایک عام سی بات ہے۔ اس میں گھبرانے یا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہی بات تھی جو وہ ساری باتیں سہل انداز میں کہے جا رہی تھی۔ کاش! وہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ لے کتنی اداسی ہے اس کے چہرے پر۔ وہ سہل انداز اختیار کر کے اپنے دل کے جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
اور چترا— اس کا تو کلیجہ ہی کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کی جدائی کا سن کر۔
ان دنوں شالنی کے دل و دماغ پر شراب کا خوف بری طرح چھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ گلاس میں پانی ڈھالنے کی آواز بھی اسے شراب کے ڈھالنے کی آواز محسوس ہوتی تھی۔

بالآخر روتی بلکتی وہ سسرال پہنچ گئی۔
سسرال میں سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا۔ نفرت کی لہر سے اس کا جسم کانپ کر رہ گیا۔
اجیت کی محبت سے دور شالنی کا من گھر کے دیگر افراد سے بھی نہیں بہل پاتا۔
اجیت کو تو شراب کی گھونٹ سے سرور آجاتا لیکن شالنی کا دل تو محبت کی کسک سے کوسوں دور تھا۔
پیار کی لذت پانے کے لیے دل میں ٹیس اٹھی۔ جسے ہونٹوں میں دبا کر رہ گئی۔
کئی سال دل کی اسی ویرانی میں گزر گئے۔

کبھی لیٹے لیٹے جب نیند نہیں آتی تو بچھڑی چترا کی یادیں اسے لمحاتی سکون عطا کرتیں۔ تب وہ اجیت اور اس کے گھر کے افراد کو بھول کر حسین کنوارے پن کے لمحات کو یاد کرتی اور مسرور ہو جاتی۔

اجیت کو تجارت کے سلسلے میں کہیں باہر جانا تھا۔ وہ اکثر تجارتی سفر پر جایا کرتے تھے۔

رات کو نو بجے جب وہ تینوں روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ کپڑوں اور دیگر سامانوں کے علاوہ شراب کی کئی بوتلیں بھی تھیں۔ آخر شالنی نے ٹوک دیا۔'' اجیت! اس وقت مت جاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

'' جاتے وقت ٹوکا مت کرو۔'' اجیت بگڑ کر بولا تو وہ چپ ہو گئی۔

اجیت اور اس کے ساتھیوں کو کھانا لگاتے وقت بھی اس نے کہنا چاہا کہ وہ سویرے نکلیں۔ لیکن ان سب کے سامنے کہہ کر وہ اجیت کی ڈانٹ سننا نہیں چاہتی تھی۔ شالنی چاہ کر بھی اجیت کو روک نہیں سکی۔

دوسری شام ایک بری خبر کے ساتھ آئی۔

'نشے کی حالت میں دیر رات تک گاڑی چلانے والا تاجر حادثے کا شکار۔' ایک کی سانس چل رہی تھی اور بقیہ دونوں موت کے منہ میں سما چکے تھے۔

اسپیڈومیٹر پر گاڑی کی رفتار ۸۰ سے ۹۰ پہنچ رہی تھی کہ گاڑی کا پہیا گڑھے میں جانے کے سبب امبیسڈر الٹ گئی۔

روتے چلاتے جب لوگ ہاسپٹل پہنچے تو موت کا شکار اجیت کو بھی اس نے پایا۔

پچھلے سات سالوں سے دکھ جھیلنے کے علاوہ ایک نئی مصیبت کا سامنا۔ حادثے کی خبر سن کر شالنی کو ایک دماغی جھٹکا لگا۔ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

جب کمرے سے باہر نکلی تو سارے زیور رنگین کپڑے اترے ہوئے تھے۔ بیوہ ساس کی پرانی ساڑی پہن کر وہ باہر آئی تو دیکھنے والوں کو کچھ شبہ ہوا۔

تیسرے دن سسرال سے اس الزام کے ساتھ واپس آئی کہ بیٹے کو کھا گئی۔ میکے پہنچی تو

چترا سے مل کر خوب روئی۔ چترا خود بھی گھبراہٹ کے سبب شالنی کو سمجھانے میں ناکام رہی۔

ادھر چترا ایم اے، بی ایڈ کرنے کے بعد ٹیچنگ لائن میں آچکی تھی۔

چترا نے شالنی سے مل کر کسی حد تک اس کے غم کو بانٹ لیا تھا۔ لیکن اس کے گھر والے شالنی سے چترا کا زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے پھر سے کالج میں ایڈمیشن کرالیا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ خود پر ٹوٹی قیامت صغریٰ کو بھولتی گئی۔ گھر والے پھر سے اس کی شادی کو فکر مند تھے۔

وہ تنہائی میں اجیت کی تصویر کو نہارتی رہتی۔

جب اس نے بی اے کمپلیٹ کرلیا تھا اور ارادہ تھا کہ نوکری کرلے اور فیصلہ کیا کہ اسے پھر ازدواجی زندگی میں نہ جانا پڑے۔ جہاں کوئی خوشی نہیں، امنگ نہیں، لطف نہیں — صرف بندش، رشتوں کے جال اور آپسی تعلقات کے داؤ پیچ ہیں۔

■■

بند مُٹھّی

عاصم کچن میں داخل ہوئے تو شرمیلی سبزی بھون رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر تھوڑا پیچھے سرک گئی۔ سوچا شاید کچھ لینے آئے ہوں۔ انہوں نے اس پر گہری نگاہ ڈالی۔ وہ گھبرا گئی۔

سب ٹھیک ہے نہ؟ گھبرانہ مت۔ میں ہوں نہ! کہتے ہوئے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کا جسم سہر اٹھا۔ جیسے صابن پر پیر پڑ گئے ہوں۔ نشیلی آنکھوں والا بہادر شخص اسے بڑی اپنائیت سے بھروسہ دلا رہا تھا۔ وہ خوش ہوگئی۔ میٹھی مسکان کے ساتھ وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔

شرمیلی کو اس گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ٹرائل کی مدت ختم ہونے والی تھی۔

عاصم نے خود کا احتساب کیا کہ میں نے تو ہمیشہ ہی غصہ سے کام لیا ہے۔ ''کتنا لوگی؟'' روبیلے انداز میں پوچھتے۔

''پانچ سو لوں گی۔''

''چار سو دوں گا۔'' وہ کہتے۔

''نہیں بھیا۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی۔'' آنے والی بھی دمدار لہجے میں کہتی۔

''جاؤ نہیں رکھنا مجھے۔ کہہ کر روانہ کر دیتے۔''

کبھی روپیہ کی جھک جھک، کبھی کام کی لاپرواہی، کبھی وقت پر نہیں پہنچنے کی شکایت انہیں پریشان رکھتی۔

اس طرح ہر دو تین مہینہ پر آیا بدلتی رہی۔

جب سے ننھا شالو آیا ہے زندگی بے حال ہو کر رہ گئی ہے۔ گھر کی فکر سے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

بیوی ٹیچر کیا ہوئیں کہ سارا سکون ختم ہو گیا۔

لاکھ منع کیا کہ ابھی نوکری جوائن مت کرو۔ لیکن کہنے لگیں۔ روز روز بھلا نوکری ملتی کہاں ہے۔ لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں سلیکشن ہوا ہے۔ کوئی معمولی بات تھوڑے ہی ہے۔

عاصم خاموش ہو گئے۔ بیوی ٹیچر ہو گئیں۔

اب ہر وقت ایک لڑکی کی تلاش میں دماغ لگا رہتا۔ جگی جھوپڑی میں جاتے۔ غریبوں کی بستی میں جاتے۔ ملنے جلنے والوں سے کہتے کہ بچہ اور گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے نوکرانی کی ضرورت ہے۔ بتایئے گا اگر کوئی نظر میں ہو تو۔

عورت کی شکل میں کام کرنے والی کئی کئی گھروں میں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ بچوں والی کا دھیان اپنے بچوں میں لگا رہتا ہے۔ جوان کمسن لڑکی کچھ ٹک پاتی تھی لیکن وہ بھی — ناغہ کرنے، بیجا ڈیمانڈ یا مالک کے روکھے سلوک کے سبب بھاگ کھڑی ہوتی۔

عاصم کو بھی وقت پر آفس پہنچنے میں کافی دشواری ہوتی۔ اپنے افسر کو گھر کی پریشانیاں بتا بتا کر مہلت لیتے رہے۔

شروع کے تین مہینے آرام سے گذر گئے۔ میٹرنیٹی لیو سے بچے کی پرورش ہوتی رہی۔ اس کے بعد کبھی نانی تو کبھی دادی اور پھوپھی نے بچے کو سنبھالے رکھا۔

اس کے بعد سب اپنے اپنے کام میں لگے رہے۔ سب کی اپنی اپنی گرہستی تھی۔ عاصم کی اپنی گرہستی میں میاں بیوی اور دو بچے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی۔ جسے خود وقت پر ڈیوٹی کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ وہ پانچ گھنٹے بڑی گردش میں گزرتے تھے۔ جب کسی غیر پر اپنی اولاد کو چھوڑ کر وہ دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ بیوی سات بجتے بجتے گھر چھوڑ دیتی۔ یہ الگ بات تھی کہ تین بجتے بجتے گھر پہنچ جاتی تھیں۔

عاصم نو بجے دفتر کی بس پکڑتے۔ چھوٹا بھائی ساڑھے نو بجے سائیکل سے روانہ ہوتے۔ جب تک آیا آ نہیں جاتی۔ نگاہ دروازے پر لگی رہتی۔

آپا کے گھر پہنچتے ہی عاصم کی جان میں جان آجاتی کہ اب جاکر وہ دفتر کے لیے روانہ ہو پائیں گے۔ مگر اب یہ لڑکی جو پانچ فٹ کی اونچائی پار کر چکی ہے ٹھیک نو بجتے بجتے گھر پہنچ جاتی ہے۔ بڑی نفاست سے ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ بولتی کم ہے مسکراہٹ سے زیادہ جواب دیتی ہے۔

عاصم نے سوچ لیا۔ اب اسے جانے نہیں دیں گے۔ اپنے غصے پر قابو رکھیں گے۔ دوستوں کا مشورہ کام آیا۔ ذرا محبت سے کام لیجئے تب نوکرانی ٹکے گی۔

شام کے وقت جب کام سے فارغ ہوکر جانے لگی تو عاصم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ دھیرے سے پچاس کا نوٹ تھما دیا۔

''لو رکھ لو اپنے لیے کچھ لے لینا۔''

''نہیں رہنے دیجئے، مہینہ جب پورا ہوگا تب دے دیجئے گا۔'' اس نے واپس دیتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بھئی یہ الگ سے ہے۔ مہینے میں سے نہیں دے رہا ہوں۔''

وہ لجا کر رہ گئی۔ بکھری انگلیوں کو نوٹ نے ایک سوتر میں باندھ دیا۔ مٹھی بند ہوگئی۔

عاصم اس کی مسکان سے مطمئن ہوگئے کہ اس نے ان کا نذرانہ قبول کرلیا۔ رات کو جب عاصم بستر پر لیٹے تو بیوی کو بے طرح پیار کرنے لگے۔ کافی دنوں بعد سکون بھرے دن اور رات سے ملاقات ہوئی تھی۔

شکیل بھائی کا مشورہ کانوں میں سرگوشی کرنے لگا۔ آخر نوکرانی کیوں بھاگ جاتی ہے۔ ذرا محبت سے کام لیجئے گا۔ ساتھ ہی دوسرا جملہ بھی یاد آیا۔ خیال رکھئے گا بیوی کو شک نہیں ہونا چاہئے۔

اگلی صبح جب سوکر اٹھے تو پچھلے دنوں جیسی بے چینی نہیں تھی۔ یقین تھا کہ وہ وقت پر آجائے گی۔ اطمینان سے اپنے کام میں لگ گئے۔ ناشتہ کیا بچے کو چمکارتے رہے۔ ساتھ ہی دروازے کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھ بھی لیتے۔

تبھی وہ کایا نمودار ہوئی۔ دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ لیکن دل کی دھڑکنیں اجازت نہیں

دے پائیں کہ جا کر خود دروازہ کھول پاتے۔ چھوٹے بھائی گولو نے دروازہ کھولا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی۔ گولو لنچ باکس لے کر گھر سے باہر دفتر کے لیے نکل گئے۔

رہ گئے عاصم۔

شرمیلی سے نظریں نہیں ملائیں۔

تھوڑی دیر بعد اس کے پاس جا کر بولے— ''سب دیکھ لوگی نہ! میں جاؤں۔''

''ٹھیک ہے جائیے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

عاصم دفتر چلے گئے۔ سارا دن من کے ہر گوشے سے خوشی پھوٹتی رہی۔ دوسرے دن نہانے کے لیے باتھ روم گئے تو کھونٹی سے قمیص غائب تھی۔ جسے جلدی میں کل دھو نہیں پائے تھے۔

کمرے میں آ کر دیکھا تو کتاب کی الماری پر تہہ کی ہوئی دھلی قمیص رکھی تھی۔ سامنے شرمیلی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

عاصم نے بھرپور نظر اس پر ڈالی اور سوچنے لگے۔ اس کے جسم پر غربت کی میل جمی ہے۔ اگر یہ میل دھل جائے تو...... اس کا حسن نکھر آئے گا۔

سنیچر کو جب ہاٹ بازار کرنے گئے تو دل میں تھا کہ شرمیلی کے لیے بھی ضرور کچھ لیں گے۔ لیکن کیا۔ یہ نہیں سوچ پائے۔

کھانے کے لیے جو سب کھاتے ہیں۔ اسے بھی مل ہی جاتا ہے۔ بیوی مہربان ہیں۔ پھل فروٹ بھی اسے دے ہی دیتی ہیں۔

ساون شروع ہو گیا تھا۔ چاروں طرف ہریالی ٹھنڈی پھوہار پڑ رہی تھی۔ راستے میں کیچڑ پانی کے باوجود عاصم کا دل خوش تھا۔ ان کی نگاہیں شرمیلی کے لیے کچھ تلاش رہی تھیں۔

سبزی خرید کر آگے بڑھے تو بساتی کی دکان پر رک گئے۔

گچھے میں لپٹی رنگ برنگی چوڑیاں انہیں بھا گئیں۔ پوچھا— ''بھئی کتنے کی ہیں۔''

آٹھ روپے درجن۔

کتنی لیا جائے۔

دو درجن بساتن نے بتایا۔

''دے دو۔'' عاصم نے کہا۔

کبھی چوڑیاں خریدنے کا اتفاق عاصم کو نہیں ہوا تھا۔ خریداری کے وقت بیوی ساتھ ہوتیں تھیں۔ جو پسند آیا خرید لیا۔ ان کا کام تو ٹوٹل پوچھ کر پیسے دینا تھا۔

اچانک انہیں محسوس ہوا یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی چار دن پہلے ہی تو پچاس روپیہ دیا ہے۔ اتنی جلدی پھر...... لیکن دوسرے ہی لمحہ خیال آیا۔ فوراً چوکنے ہو گئے کہ کتنی مشکل سے یہ شرمیلی مل پائی ہے۔ اسے باندھے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ الگ سے خرچ کیا جائے۔ خرچ ہو تو ہو۔ یہ ہاتھ سے نہیں جانی چاہئے۔

باپ رے باپ۔ کتنی مشکل کے دن گذارے ہیں۔ سوچ کر منہ سے آہ نکلی۔ جھٹ سے روپیہ دیا۔ چوڑی کا بنڈل بندھوایا اور چل پڑے۔ گھر پہنچ کر موقع ملتے ہی بنڈل تھما دیا۔

اگلی صبح جب شرمیلی بچے کے کپڑے دھونے باتھ روم میں پہنچی تو عاصم نے آگے بڑھ کر کہا— ''کپڑے ٹب میں بھگا دینا۔ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے نہیں بھگا پایا۔''

تھوڑی دیر بعد عاصم کی پینٹ سے نکلے کچھ سکے لے کر وہ باہر آئی۔ ''صاحب آپ کے پیسے'' کہتے ہوئے سکے ٹیبل پر رکھ دیئے۔

اب عاصم کی ضرورت کی تمام چیزیں سلیقے سے رہنے لگیں۔ بالوں کے کنگھے، تولئے دھل کر صاف ہو گئے، شرٹ کے کالر چمک اٹھے، بنیائن کی باس جاتی رہی۔

یہ کیا ہو گیا۔

بیوی جب سے ٹیچر ہوئی ہیں۔ وہ تو عاصم کا خیال رکھنا ہی بھول گئی۔ انہیں دونوں بیٹوں اور نوکری کی فکر لاحق رہتی۔

بیوی کو اس وقت بہت برا لگا جب عاصم انہیں پیار کرنا ہی بھول گئے۔ جب بستر پر لیٹتے تو شرمیلی کی یادوں میں ڈوب جاتے۔ اس کا گورا جسم اس کا حسن نگاہوں میں گردش کرتا۔ وہ بیقراری میں کروٹیں بدلتے ہوئے آخر کار سو جاتے۔

بیوی پہلو میں ہوتی ضرور لیکن اس کی تپش محسوس نہیں کر پاتے۔ بیوی کو شک نہ ہونے پائے اس لیے کام دیو کے آخری باڑ کو نظر انداز نہیں کر پاتے۔

شرمیلی! تم بہت اچھی ہو۔ ان کے منہ سے نکلا۔

بیوی کے کانوں میں جیسے شیشہ گھل گیا ہو۔ پوری طاقت سے انہیں پرے ڈھکیل دیا اور اٹھ بیٹھیں۔ مکمل آسودگی کیا ملتی۔ بیوی کے شکی وار نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ فوراً سنبھل گئے۔

''میں نے تو مذاق میں اس کا نام لیا تھا۔''

یہ مذاق نہیں ہے۔ آپ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔

اگلے دن سے وہ محتاط ہو گئیں۔ اسکول آج نہیں جاسکیں۔ شرمیلی وقت پر آ گئی۔ عاصم نہا کر کمرے میں جا چکے تھے۔

شرمیلی بچوں کے کپڑے لے کر باتھ روم میں گئی تو بیوی نے کہا— ''ذرا عاصم کے کپڑے بھی دھو دینا۔''

لڑکی ہوشیار تھی۔ بولی— ''میں نے بچوں کے کپڑے دھونے کا ذمہ لیا ہے۔ مردانے کپڑے دھونے کا نہیں۔'' بیوی خاموش ہو گئیں۔

اس کا مطلب عاصم اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں۔ آئرن مجھ سے کرواتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مذاق ہی رہا ہو۔ مجھے چڑھانے کے لیے۔

عاصم کے کانوں میں آواز جا رہی تھی۔ ان کے دل نے کہا— ''گڈ'' لڑکی تم ٹھیک جا رہی ہو۔

جب دفتر کے لیے نکلے تو راستے بھر سوچتے رہے۔ شرمیلی کو اس کی ہوشیاری کا انعام ضرور ملنا چاہئے۔

واپسی میں شام کو بس سے اترے تو محلے کی دکان سے شیمپو کی منجھولی شیشی خرید لیا۔ پھر سوچا۔ بغیر صابن کے شیمپو ادھورا ہے۔ سومارگو کی ایک چھوٹی ٹکیہ بھی خرید ڈالی۔

اب کیا تھا۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو سیڑھی کے نیچے موکے میں وہ دونوں چیزیں رکھ دیں۔ گھر میں وہ موجود تھی۔

بیوی پڑوسن کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ شرمیلی ناشتہ چائے لگا چکی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر عاصم نے بتا دیا۔

''سیڑھی کے نیچے موکے میں کچھ ہے جاتے وقت لے لینا۔''
شرمیلی ان کے اشاروں کو سمجھنے لگی تھی۔

اتوار کا دن ہے۔ مالکن گھر کے کاموں میں لگی ہیں۔ شرمیلی ان کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔
جھاڑو لگانے کے بعد پوچھا کر رہی ہے۔ تبھی اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں۔
مالکن کی نظریں اس پر پڑیں۔ ''بہت خوبصورت لگ رہی ہیں چوڑیاں۔''
عاصم کا دل دھک سے ہوگیا۔ کہیں یہ لڑکی بتا نہ دے۔ میں تو اسے منع کرنا ہی بھول گیا۔ ''مامی آئی ہیں۔ انہوں نے یہ چوڑیاں دی ہیں۔'' شرمیلی نے بتایا۔ مالکن کے دل کو تسلی ہوتی چلی گئی۔

ہر شام عاصم گھر آتے تو کھانے کا بہت سارا سامان لے کر آتے۔ یہ سب دیکھ کر ایک دن شرمیلی نے کہا— ''میری مٹھی کھلی رہ گئی صاحب۔''
''کیا مطلب؟'' عاصم نے پوچھا۔
بند مٹھی کے ساتھ گھر جانا مجھے بھی پسند ہے۔ تم دفتر سے روز اوپری کمائی کر کے آتے ہو۔ میں بھی کمائی کے لیے ہی گھر سے باہر نکلی ہوں۔ جب تک اوپری کمائی نہ ہو۔ من خوش نہیں رہتا۔ پھر تھوڑا رک کر بولی۔

''میں تمھیں سکھ دیتی ہوں۔ دیکھو صاحب! ہماری سیوا سے آپ کھل اٹھے ہو۔ ہمارے اس کام سے جسم کا ہی نہیں آتما کا بھی دوہن ہوتا ہے۔''
ہم پر پیار کی نظر کوئی نہیں ڈالتا۔ سب کوئی بھوکی نظر ڈالتا ہے جس سے ہم گنہگار بھی بنتے ہیں۔ جب چاہا کام پر رکھا۔ جب چاہا نکال دیا۔ لیکن آپ ایسے نہیں ہیں۔ صاحب آپ کی نظر میں ہماری قدر ہے۔'' مالکن کو قریب آتا دیکھ کر شرمیلی چپ ہوگئی۔
اب عاصم اسے برابر دس بیس روپے دینے لگے۔ وہ مسکرا کر ان کی بھینٹ قبول کرنے لگی۔ ساتھ ہی مرد کی مسکان اور اسپرش اسے سکھ دینے لگا۔

ایک دن دفتر جاتے وقت عاصم دوبارہ کمرے میں آئے۔ الماری سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بھی چوکھٹ پر کھڑی انہیں دیکھتی رہی کہ کب وہ گھر سے باہر جائیں اور وہ

دروازہ بند کر کے بیٹھے۔

اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر عاصم کو حوصلہ ملا۔

"کیا بات ہے، دل لگ رہا ہے نہ؟ کوئی پریشانی نہیں ہے نہ؟"

"ہے۔"

عاصم اس کے قریب آ گئے۔

مٹ میلی کا یاد ھل کر صاف ہو چکی تھی۔

شیمپو کی خوشبو نے بالوں کو بغور دیکھنے پر مجبور کیا۔ سیاہ بال چمک اٹھے۔ "آپ بہت اچھے ہیں صاحب، وہ بول گئی۔"

عاصم کو جیسے بن مانگی مراد مل گئی۔ انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے چہرے کو تھپکی دی۔

سکون کی گہری سانس شرمیلی کے منہ سے نکلی۔ اس کی کامنائیں ڈھیر ہو گئیں۔ اب وہ کھڑی نہیں رہ پا رہی تھی۔

صاحب جائیے۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ کہتے ہوئے ان سے الگ ہو گئی۔ الگ ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔

شرمیلی پر ساون کی پہلی بوچھار پڑ چکی تھی۔ اس کی پیاس بڑھ گئی۔ گھنگھور بارش بھی اس کی پیاس بجھانے میں شاید ناکام ہو جائے۔

عاصم ایک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر آنکھوں کو بانہہ سے ڈھک لیا۔

عاصم پلنگ پر بیٹھ گئے۔

زرخیز زمین کے کانپتے اوروج پر جھک گئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سورگ کی چاندنی کا رنگ اس کے چہرے پر اتر آیا۔ واسنا کا پنک پھیل کر سچائی کو پہنچ گیا۔

اب وہ نرلج— عریاں اور— قربان تھی۔

■■

BAND MUTTHI

(Stories)

by

Nasreen Bano

نسرین بانو نے پٹنہ یونیورسٹی سے ہندی اور اردو میں ایم اے کی ڈگری گولڈ میڈل (اردو) کے ساتھ حاصل کی۔ وہ بی ایڈ ہونے کے ساتھ ہی پی ایچ ڈی (ہندی) کے اعزاز سے بھی سرفراز ہیں۔

ہندی افسانوی ادب میں ان کا تخلیقی سفر مسلسل جاری ہے۔ ہندی کہانیوں کا ان کا پہلا مجموعہ ''چھاؤں کی دھوپ'' کے عنوان سے ۱۹۹۹ میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جبکہ ۲۰۰۹ میں شائع ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''دھرتی ماں کا زخم'' کی بھی زبردست پذیرائی ہوئی۔ ''ایک اور کوسی'' (اردو ناولٹ) ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی۔ ۲۰۰۹ میں ہی ان کی تھیسس ''نرالا کی رچناؤں میں مانویہ بھاونا'' شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے۔ ان کی کہانیاں اور مقالات نہ صرف موقر اردو ہندی روزناموں اور رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں بلکہ آکاشوانی، دوردرشن، پٹنہ سے بھی نشر ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی اثر دار شرکت سے مختلف ادبی وسماجی سرگرمیوں میں جان پھونکتی رہی ہیں۔

رابطہ : نسرین بانو، سکشن افسر، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ- 800015

موبائیل : 9835401108

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-680-6